www.urducouncil.nic.in
قیمت : -/15 ₹

آدھی آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان

ماہنامہ

خواتین دنیا

نئی دہلی

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

جنوری 2026

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
نئی دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
دلچسپ کہانیاں
سائنس و ٹیکنالوجی

معلوماتی مضامین
صحتِ اطفال
بچّوں کا کتب خانہ

ان کے علاوہ:

کہکشاں ♦ زبان شناسی

میرا بچپن ♦ بچوں کے بڑے ادیب

بچوں کی پینٹنگ ♦ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

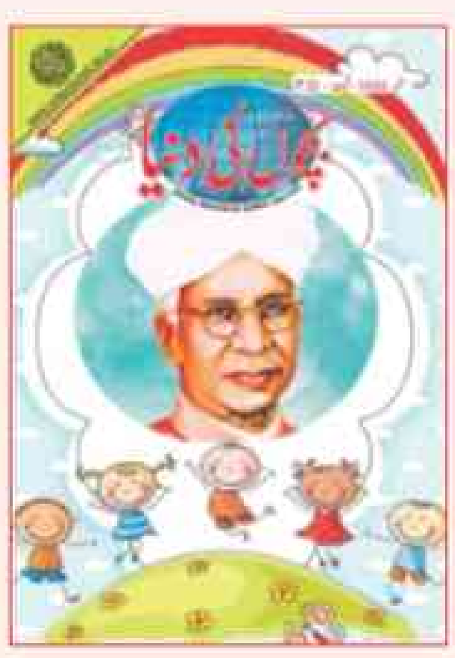

سب سے زیادہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 15 روپے   سالانہ: 145 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرتعاون سالانہ 145 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in

شاخ: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلیکس بلاک نمبر 1-5، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 040 - 24415194

آدھی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان
ماہنامہ
خواتین دنیا
نئی دہلی
Mahnama Khawateen Duniya Monthly, New Delhi

جلد: 10 شمارہ: 1 جنوری 2026

مدیر اعلیٰ : ڈاکٹر شمس اقبال

مدیر منتظم : ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی

معاون مدیر : ڈاکٹر مسرت

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
وزارت تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند
مطبع: میکاف پرنٹرس، B-127، سیکٹر 65
نوئیڈا۔ 201301 (یوپی)

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل
قیمت -/15 روپے، سالانہ -/145 روپے
صفحات: 64 Total Pages

■ قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL)
اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
● ڈرافٹ NCPUL، New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا
جسولہ، نئی دہلی-110025، فون: 011-49539000
شعبۂ ادارت: 011-49539009
نگارشات ارسال کرنے کے لیے
ای میل: kduniya@ncpul.in
editor@ncpul.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی۔ 110066
فون: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1، پتھرگٹی، حیدرآباد-500002
فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

اداریہ

مشعل	مدیر	4

شخصیات

محمدی بیگم کی ادبی خدمات	شفا	5
حمیدہ سالم کی خودنوشت: فکری و تہذیبی تناظر	فرحین خانم	8
فاطمہ بیگم پروین کی تنقیدی خدمات	سبزار سکندر سہہ	13

روداد

روداد: علی گڑھ کتاب میلہ 2025	ادارہ	17

جہان نسواں

راجستھانی زبان کی ادیبہ رانی لکشمی کماری چونڈاوت	فرخندہ ضمیر	21
اردو خاکہ نگاری میں خواتین کا حصہ	سمرین بانو	25
ناول 'زوال' کا تجزیاتی مطالعہ	مسرت جہاں	29
خواتین کے افسانوں میں خواتین کے مسائل	شائقہ آفرین	33
نورشاہ کی افسانہ نگاری: حقیقت اور رومان کا سنگم	صبی جی	37
اطہر پرویز کے شخصی خاکوں کا تنقیدی مطالعہ	نگہت	42
آفاق حسین صدیقی کی شخصیت و کردار اور ادبی خدمات	روبی خاتون	46

حسن سخن

نظم	نعیمہ امتیاز شمع	49
غزل	فرحین شکیل	49
نظم	انزلا بی	50

افسانے

بھروسہ	نشاں زیدی	51
سیلاب	سعدیہ فاطمہ عبدالخالق	55
بیٹیاں	فوزیہ حبیب	59

قارئین کے خطوط

تاثرات		62

مشعل

قومی اردو کونسل ابتدا سے ہی اردو ادب کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کرتی رہی ہے۔ کونسل نے اردو زبان و ادب کے ساتھ ساتھ مختلف شعبہ ہائے حیات سے متعلق تمام علوم ومضامین کو اردو زبان کے ذریعے عوام وخواص تک پہنچانے میں کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ اپنے قیام سے ہی اس نے مختلف میدانوں میں مختلف علمی و ادبی سرگرمیوں کے باعث ملک کے ہر خطے اور ہر زبان کے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا اور اردو کے تئیں اپنی ذمہ داری اور اختیارات کا ثبوت دیا ہے۔ قومی اردو کونسل اپنی سرگرمیوں کے ذریعے ملک کے طول وعرض میں پہنچی ہے اور اپنی اسکیموں کو علمی و ادبی حلقوں میں متعارف کرایا ہے۔ کونسل کی بیشتر اسکیموں کا مقصد ہی اردو کو تعلیمی و علمی میدانوں میں روزگار کے نئے مواقع پیدا کرنا ہے۔

اردو زبان و ادب کے تئیں قومی اردو کونسل نے ہمیشہ فعالیت وتحرک کا ثبوت دیا ہے اور ہمیشہ اپنے مقصد کے تئیں کوشاں رہی ہے۔ اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کے لیے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے نہایت ہی سنجیدگی سے اپنے وسائل کا استعمال کیا ہے۔ اردو زبان کو تعلیمی وثقافتی ورثے سے جوڑنے کے لیے اس نے ملک کے طول وعرض میں مختلف ادبی سرگرمیوں کو انجام دیا ہے اور ہندوستان کی ثقافتی شناخت کو مضبوط کیا ہے۔ اردو زبان و ادب کو مضبوط اور مستحکم کرنے میں قومی اردو کونسل کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ ملک کے طول وعرض میں کونسل نے اپنے جمہوری کردار کو اپنی سرگرمیوں کے ذریعے منوایا اور اردو کی شناخت کو باقی رکھا ہے نیز ملکی وقومی فلاح وبہبود وفضا سازی کے لیے ہمیشہ بیدار رہی ہے۔ اردو کتاب میلوں کا انعقاد بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ کونسل اب تک پچیس سے زائد اردو کتاب میلوں کا انعقاد ملک کے مختلف خطوں میں کر چکی ہے۔ ان کتاب میلوں کے ذریعے نہ صرف اردو ورثے کو قارئین تک پہنچایا گیا بلکہ قاری کو کتاب کے نزدیک لانے کی بھی کوشش کی گئی۔

اردو کتاب میلے نہ صرف اپنی شناخت مستحکم کرتے ہیں بلکہ اپنی تہذیبی ثقافت کے بھی ترجمان ہوتے ہیں۔ کتاب میلوں کے انعقاد سے صرف خواص ہی نہیں عوام بھی علم و ادب کے کرشموں وفوائد سے آشنا ہوتے ہیں۔ اسکول و کالج کے طلبہ کونسل کے نوع بہ نوع خوبصورت پروگراموں سے متاثر ہوتے ہیں اور اپنی زندگی مزین کرنے کے لیے پرواز کا حوصلہ لے کر اپنے گھروں کو لوٹتے ہیں۔ نئے عزم وجذبے سے کچھ کر گزرنے کا ارادہ کرتے ہیں۔ اکثر اوقات منعقدہ پروگراموں کے بعد کونسل کے صدر دفتر کے در ودیوار کا دیدار کرتے ہیں۔ نیز اپنی پسند کی کتابیں خریدتے ہیں اور اپنے بہتر مستقبل کے لیے سنجیدہ کوشش کرتے ہیں۔

ادب وشاعری جہاں لطف وانبساط کا وسیلہ ہے وہیں اس سے زندگی میں نرمی ونفاست اور سلیقہ وقرینہ بھی پیدا ہوتا ہے۔ خوش سلیقگی سے معاشرت پر بہتر اثر پڑتا ہے، ایک اچھے سماج کی تشکیل ہوتی ہے۔ اپنی کارکردگی سے قومی اردو کونسل معاشرے میں نمایاں کردار ادا کر رہی ہے۔

آپ کا

شمس اقبال

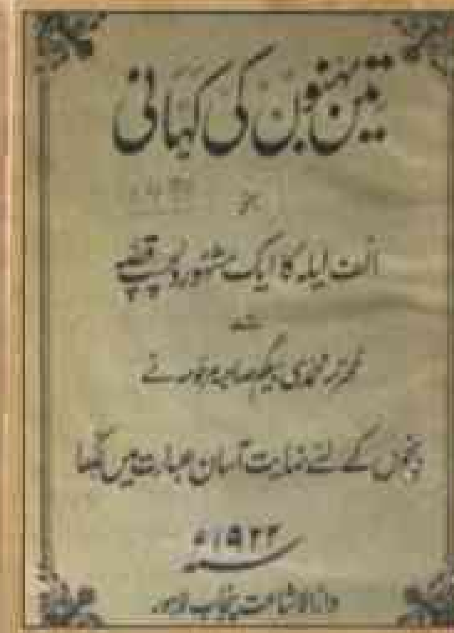

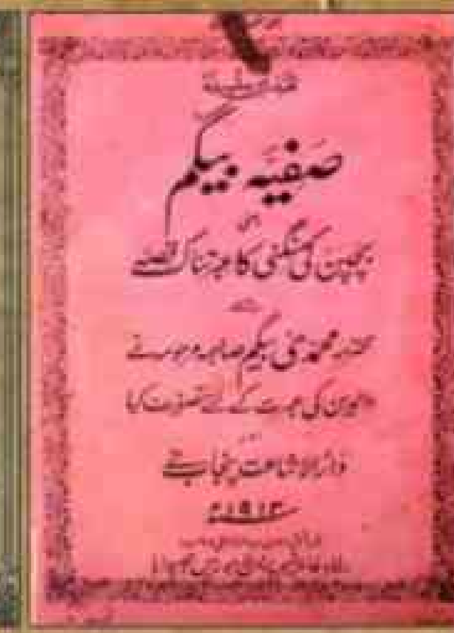

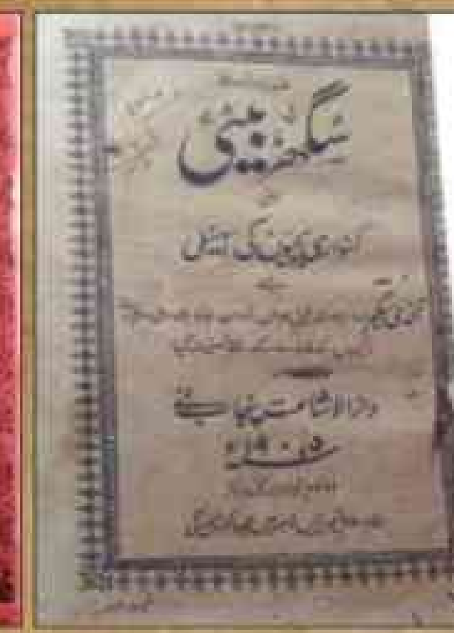

شفا

محمدی بیگم کی ادبی خدمات

محمدی بیگم ایک ایسی شخصیت ہیں جن کا نام تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ یہ ایک مشہور ادیبہ، ناشر، مترجم ہونے کے ساتھ ہی ساتھ پہلی خاتون ایڈیٹر بھی تھیں۔ محمدی بیگم ادب کی تاریخ میں منفرد مقام رکھتیں ہیں چونکہ ان کی سوچ اور ان کے رواں قلم نے نہ صرف ان کو بلندیوں پر پہنچایا بلکہ ہر اس خاتون کی رہنمائی کا باعث بنی، جو کچھ کر دکھانے کا جذبہ تو رکھتی تھیں لیکن ان کو قدامت پرستی کی بیڑیوں نے روک رکھا تھا، جو ذہین تو تھیں لیکن گھر کی چار دیواری میں قید تھیں۔

محمدی بیگم کی پیدائش 22 مئی 1878 میں دہلی میں سید احمد شفیع کے گھر پر ہوئی۔ انیسویں صدی کے اس قدامت پرست دور میں جب خواتین کی تعلیم و تربیت پر کوئی خاص توجہ نہیں دی جاتی تھی، اس وقت محمدی بیگم کے والدین نے انھیں ایسا علمی ماحول عطا کیا جس میں پرورش پا کر انھوں نے نہ صرف کتابی علم حاصل کیا بلکہ زمانے کی نشو و نما سے بھی واقف ہوتی رہی۔

محمدی بیگم کی شادی 1897 میں معروف ناشر، مترجم، رفاہ عالم پریس کے مالک اور زنانہ اخبار تہذیب نسواں کے بانی شمس العلما مولوی ممتاز علی سے ہوئی۔ یہ محمدی بیگم کی خوش نصیبی تھی کہ شادی کے بعد بھی ان کے شوہر نے ان کی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا چونکہ سید ممتاز علی عورتوں کی تعلیم کے زبردست حامی تھے، اس لیے انھوں نے ایک ہفتہ وار اخبار 'تہذیب نسواں' کے نام سے 1898 میں جاری کیا، جس کا مدیر انھوں نے اپنی بیوی محمدی بیگم کو بنایا تا کہ محمدی بیگم (جو ایک تعلیم یافتہ خاتون تھی) عورتوں کے معاملات کو اچھے سے سمجھ سکیں، ان پر اظہار خیال کرتے ہوئے انھیں ہدایت دے سکیں اور انھیں ان کے حقوق کے بارے میں بھی بتا سکیں۔

> 'تہذیب نسواں' وہ اخبار ہے جس میں عورتوں کے ہر مسئلے کو حل کرنے کے لیے مضمون لکھے جاتے تھے، انھیں تعلیم یافتہ ہونے کے فوائد بتائے جاتے، انھیں گھر کے تمام کاموں میں سوگھڑ ہونے کی ہدایت دی جاتی تھی۔ الغرض، اس اخبار کا ہر مضمون عورتوں کا تھا اور عورتوں کے لیے تھا۔ جس نے خواتین کو ترقی کی راہ پر گامزن کر دیا جیسا کہ سید محبوب عالم نے اپنی کتاب 'اردو صحافت کی ایک نادر تاریخ' میں لکھا ہے کہ تہذیب نسواں کے ذریعے خواتین نے اردو زبان کی ترقی و ترویج میں فعال اور منظّم کردار ادا کیا۔ 1

اس کے علاوہ Sumit Sarkar and Tanikar Sarkar اپنی کتاب Women and Social Reform in Modern India :A Reader" میں تہذیب نسواں کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> "Tahzib un-Niswan was not the first Urdu periodical for women , but it was the first to survive , and it changed the lives of thousands of purdah-observing women over the years by giving them a window on the world beyond the narrow walls of their

Zananas.Tahzib contained new ideas on housekeeping and childrearing , featured and encouraged creative writing by women , discussed women's legal rights in Islam and their necessity for the mother of the next generation to be educated and invited letters from it's readers to the editor ,Muhammadi Begum ,who as a woman understood their problem.Tahzib un -Niswan was an important element in the broader movement for women's education among Indian Muslims in the late nineteenth and early twentieth centuries." 2

محمدی بیگم نے اس کے علاوہ ایک اور ماہوار رسالہ 'مشیر مادر' کے نام سے نکالا تھا۔ اس رسالے میں شائع ہونے والے مضامین کے ذریعے انھوں نے ماؤں کو بچوں کی تربیت سے متعلق ہدایت اور مشورے دیے تا کہ خواتین کو بچوں کی اچھی پرورش کرنے کا علم حاصل ہو سکے۔ یہ رسالہ کچھ وقت تک ہی جاری رہا پھر محمدی بیگم نے وقت کی قلت کے سبب اسے اخبار تہذیب نسواں میں ہی ضم کر دیا۔

محمدی بیگم نے 1907 میں 'انجمن خاتون ہمدرد' کی بنیاد ڈالی جس کے تحت خواتین کو نہ صرف ذہنی طور پر بلکہ مالی طور پر بھی مدد فراہم کی گئی تا کہ خواتین کی ترقی میں کوئی بھی جز ورکاوٹ کا باعث نہ بنے۔ اس کے بعد محمدی بیگم نے 'انجمن تہذیب نسواں' کے نام سے ایک اور انجمن قائم کی، اس انجمن نے بھی خواتین کے حالات کو سدھارنے کی ہر ممکن کوشش کی۔

محمدی بیگم کی ان خدمات کے علاوہ ان کی بہت سی تصنیفات بھی کی ہیں، جو حسب ذیل ہیں:

1۔خانہ داری، 2۔آداب ملاقات، 3۔لغت خانہ، 4۔ رفیق عروس، 5۔حیات اشرف، 6۔سوگھڑ بٹی، 7۔شریف بیٹی، 8۔ چندن ہار، 9۔خواب راحت، 10۔آج کل، 11۔ صفیہ بیگم، 12۔ سچے موتی، 13۔انمول موتی 14۔آرسی، 15۔امتیاز پچیسی، 16۔تاج پھول، 17۔ریاض پھول، 18۔تاج گیت، 19۔تین بہنوں کی کہانیاں، 20۔علی بابا چالس چور، 21۔ دل پسند کہانیاں، 22۔ پان کی گلوری، 23۔چوہے بلی نامہ، 24۔دلچسپ کہانیاں۔

محمدی بیگم کا نام ادب کی ان خواتین میں سے ہے جنھوں نے مضمون نگاری کی داغ بیل ڈالی۔ محمدی بیگم کے مضامین ان کی سوچ اور ان کی اس جدوجہد کو پورے طریقے سے روشناس کراتے ہیں، جس کی اس وقت کے سماج کو بے حد ضرورت تھی۔ مضمون نگاری کا مطلب ہے کہ کسی موضوع پر اپنے خیالات کو مربوط اور مدلل انداز میں اس طرح پیش کیا جائے کہ پڑھنے والا اس کو سمجھ کر اس سے متاثر ہو۔ مضمون کسی نہ کسی مقصد کے تحت ہی لکھا جاتا ہے، اس طرح محمدی بیگم کے مضامین کا بنیادی مقصد عورتوں کی تربیت اور ان کی اصلاح تھا۔

محمدی بیگم کے مضمون کے دو مجموعے بہت اہمیت رکھتے ہیں پہلا مجموعہ 'خانہ داری' ہے جس کی اشاعت 1922 میں ہوئی تھی۔ اس مجموعے کے نام کی مناسبت سے اس میں خانہ داری سے متعلق ہر موضوع پر مضامین لکھے گئے ہیں، جس میں آسائش اور تہذیب و کفایت شعاری سے رہنے کے قاعدے بتائے گئے ہیں، اس مجموعے میں 154 مضامین شامل ہیں اور سب کا تعلق ہندوستانی گھر کے رکھ رکھاؤ اور اس کی وضع قطع سے ہے، مثلاً ان کے گھریلو

موضوعات جیسے مکان، باورچی خانہ، روٹی پکانا، صاف پانی، وغیرہ ہیں۔ اس مجموعے کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے ممتاز علی اس مجموعے کے دیباچے میں کہتے ہیں کہ

> ”غالباً یہ کتاب ان امراء ورسا کے گھروں کے لئے تو کارآمد نہ ہو۔جنھوں نے اپنے گھر کی کایا پلٹ کر کے ہر ایک بات میں انگریزی وضع اختیار کر لی ہے۔لیکن ان شرفا کے گھروں میں جو اپنی دیسی وضع پر قائم ہیں اور اپنی خانہ داری میں بقدر ضروریات زمانہ تہذیب جدید کی مفید ومناسب ترمیمات داخل کر لی ہیں۔ یہ کتاب یقیناً خاطر خواہ طور پر مفید ثابت ہوگی اور ناظرات اس کو جملہ دوسرے کتابوں سے جو اس موضوع پر لکھی گئی ہیں۔زیادہ مفید۔جامع اور کارآمد پائیں گی۔3“

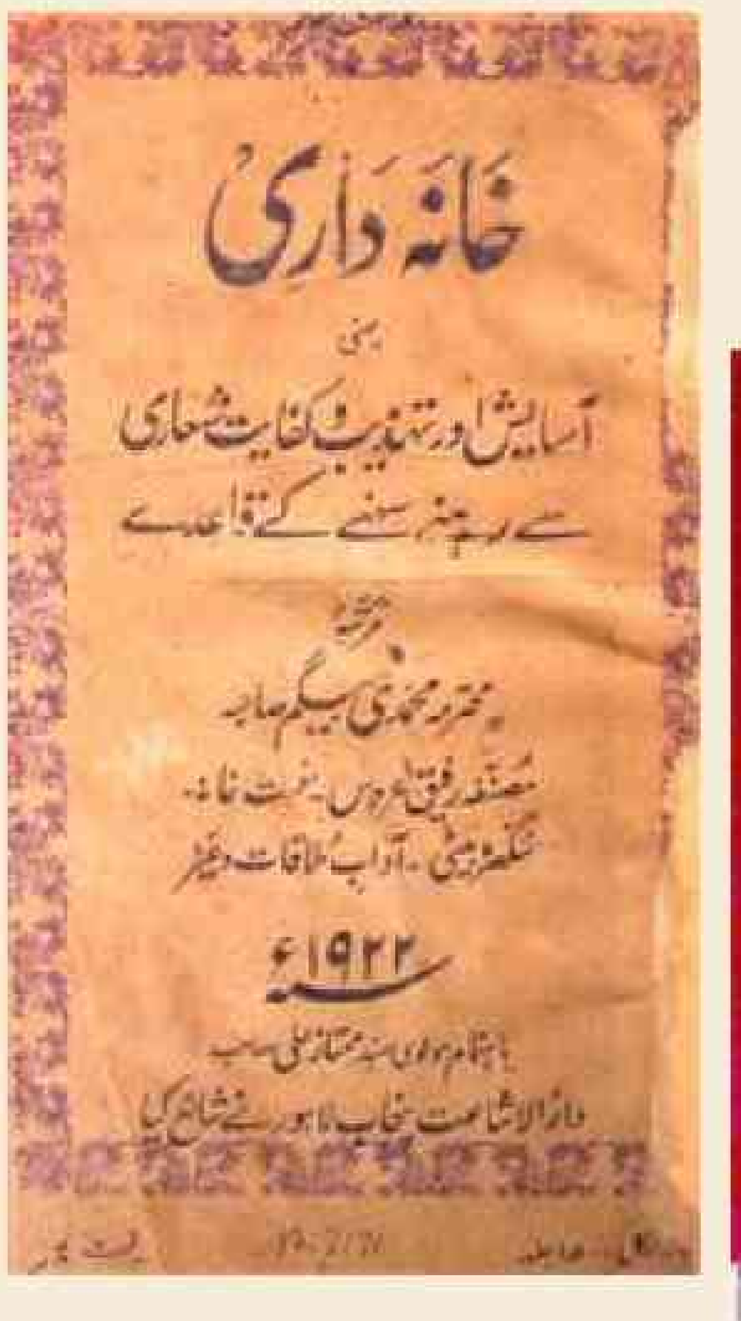

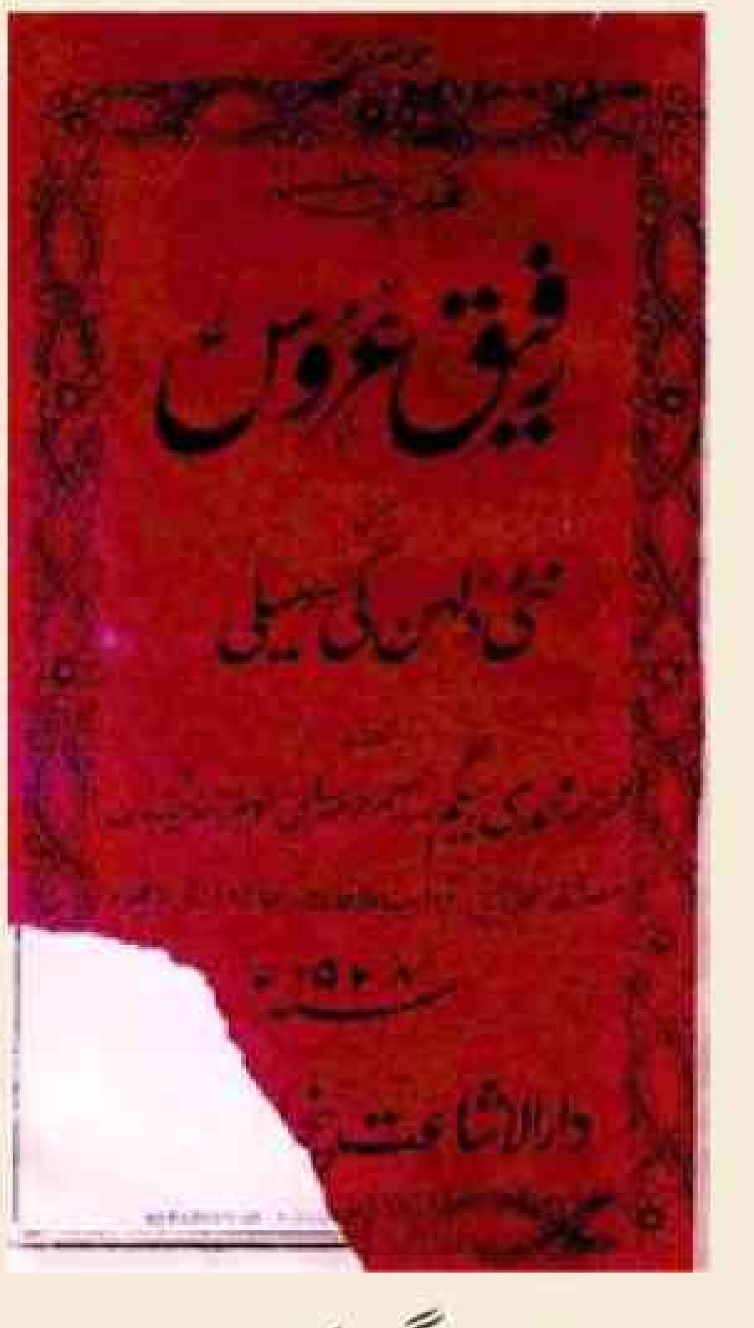

محمدی بیگم کے مضامین کا دوسرا مجموعہ ’رفیق عروس‘ کے نام سے 1978 میں شائع ہوا۔ اس میں کل 23 مضامین شامل ہیں۔ جیسا کہ اس مجموعے کے نام سے ظاہر ہے کہ رفیق عروس ہے یعنی دلہن کی سہیلی۔اس لیے اس مجموعے میں ان تمام مسائل پر تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے، جو ہر خاتون کی زندگی میں اس وقت پیش آتے ہیں جب اس کی شادی ہوتی ہے۔ اس مجموعے کے موضوعات ۔شادی آزادی نہیں، ناتجربہ کاری، خاوند کی مزاج شناسی، وغیرہ یہ تمام مضامین ایسے ہیں جو کسی بھی خاتون کو سوگھڑ بیوی بنانے کے لیے کارآمد ثابت ہوتے ہیں۔

محمدی بیگم کے تمام مضامین کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے مضامین صحافتی قسم کے ہیں۔صحافتی مضمون کا مطلب ہوتا ہے کہ ایسے مضامین جن کا تعلق موجودہ حالات سے ہو یا کسی تازہ معاشرتی مسئلے سے۔اس طرح محمدی بیگم کے مضامین میں اس وقت کے سماجی مسائل ان کے حل کا بھرپور طریقے سے بیان ملتا ہے۔

الغرض محمدی بیگم ایک تعلیم یافتہ خاتون، سوگھڑ بیوی، اچھی مضمون نگار ہونے کے ساتھ ہی ساتھ ایک مصلح کی حیثیت بھی رکھتی تھیں۔محمدی بیگم دور بین نگاہ کی مالک تھی، ان کی نظر زمانے کے ہر اس پہلو پر تھی جو سماج کی ترقی میں رکاوٹ بنا ہوا تھا۔ انھیں اس بات کا بخوبی علم تھا کہ اس وقت کا سب سے زیادہ غور وفکر کا موضوع عورتوں کی بیزاری اور بے علمی دور کرنا ہے۔ اس لیے انھوں نے خواتین کی ترقی اور تربیت کا بیڑا اٹھایا۔محمدی بیگم ادب کا ایک ایسا سورج ہے جن کی روشنی نے نہ جانے کتنی خواتین کی زندگی کو منور کر دیا۔حالانکہ محمدی بیگم کا انتقال 2 نومبر 1908 میں 30 سال کی عمر میں ہو گیا تھا، لیکن اتنے قلیل عرصے میں بھی اس خاتون نے ایسے کارنامے انجام دیے جن کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

حوالے

1 ص 161، اردو صحافت کی ایک نادر تاریخ، سید محبوب عالم، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور، 1992

2 ص 360، سمت سرکار اور تانکا سرکار، جدید بھارت میں خواتین اور سماجی اصلاح: ایک مطالعہ، 2008

3 ص ب، خانہ داری، محمدی بیگم، دارالاشاعت پنجاب لاہور، 1922

□□□

Shifa
Research Scholar
Department of Urdu
M.J.P.Rohailkhand University
200, Jagatpur Old City
Bareilly - 243005(U.P)

شخصیات

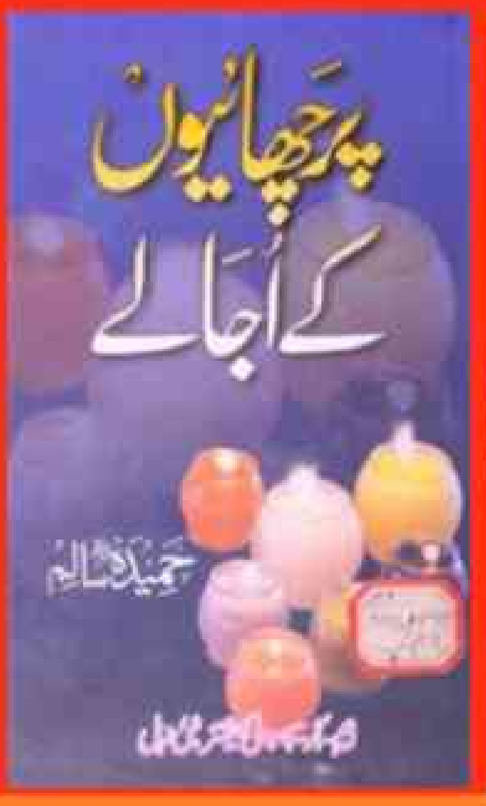

فرحین خانم

حمیدہ سالم کی خودنوشت

فکری و تہذیبی تناظر

حمیدہ سالم (پیدائش 1922) کی خودنوشت 'شورش دوراں' اور اس کا تکملہ 'ہم ساتھ تھے' بیسویں صدی کے وسطیٰ ہندوستان اور خاص طور پر اودھ کی جاگیردارانہ اور ادبی تاریخ کا ایک مستند ریکارڈ پیش کرتی ہیں۔ ان کی پیدائش لکھنؤ کے قریب قصبہ ردولی میں ہوئی، جو سراج الحق اور بنی بخش کے گھر ایک ایسے خاندان میں آنکھ کھولنے کا سبب بنا جہاں ادب، سیاست اور دانشوری کی روایت نسل در نسل چلی آ رہی تھی۔ ردولی کا پرانا نام رودولی تھا اور یہ وہ علاقہ تھا جہاں سے اجودھیا تک سائیکل سے سفر عام تھا۔ یہ قصبہ اپنی جاگیردارانہ سماجی ساخت کی وجہ سے خاص اہمیت رکھتا تھا۔ حمیدہ سالم کے بچپن کی یادیں، جن میں حیدر گنج میں چھٹیاں گزارنا، بیل گاڑی کا سفر اور قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہونا شامل ہے، اس دور کی سادگی اور معصومیت کی عکاسی کرتی ہوئی لکھتی ہیں۔

''میری پیاری اور خوبصورت یادیں حیدر گنج سے وابستہ ہیں جہاں پہنچ کر ہم ایک طرح سے کھلی ہوا میں سانس لیتے تھے۔ ردولی سے حیدر گنج کا سفر ہماری ماں اور بڑی بہن پالکیوں میں چار کہاروں کے کاندھے پر طے کرتی تھیں۔ ہم بچے اور ساتھ کا سامان بیل گاڑی میں جاتا تھا۔ بیلوں کی وہ دھیمی دھیمی چال اور راستہ کی گرد و دھول اس وقت کس کو پرواہ تھی۔ جہاں چنے یا مٹر کا کھیت ملا آم یا امرود سے لدے پیڑ نظر آئے ہم چپکے سے پھسل کر بیل گاڑی سے اتر گئے اور اپنی جھولی بھر کر دوڑ کر پھر بیٹھ گئے اس کا اندیشہ نہ تھا کہ گاڑی چھوٹ جائے گی، بہت سے گاڑی چلانے والے کو بیلوں کی رفتار دھیمے سے دھیمے تر کرنی پڑتی تھی۔'' [1]

ان کی تحریروں کا ایک نمایاں پہلو ان کا نثری اسلوب ہے جو کہ نہایت سادہ، بے تکلف اور برجستہ ہے۔ اگرچہ وہ اِکونومِکس کی طالبہ تھیں اور اردو ادب میں ان کی کوئی باقاعدہ تربیت نہیں تھی لیکن ان کی نثر میں سادگی کے باوجود ایک پختگی اور روانی پائی جاتی ہے۔ انھوں نے مشکل الفاظ کے استعمال سے گریز کیا ہے جس کی وجہ سے ان کی تحریر میں بھی بوجھل پن محسوس نہیں ہوتا۔ حمیدہ سالم خود کو ایک معمولی خاتون سمجھتی تھیں اور ان کی تحریریں اسی عاجزی اور سچائی کو ظاہر کرتی ہیں لیکن وہ حالات و واقعات پر جہاں ضروری ہو وہاں طنزیہ جملوں کے ذریعے گہرا تبصرہ بھی کرتی ہیں۔

'شورش دوراں' میں ردولی کے طبقاتی نظام کی باریک بینی سے وضاحت کی گئی ہے۔ انھوں نے بیان کیا ہے کہ ردولی کی آبادی زیادہ تر مسلمان زمینداروں اور تعلق داروں پر مشتمل تھی جن کے زیر اثر خدمت گزار طبقات جیسے حجام، حلوائی اور گھوسی وغیرہ تھے۔ یہ نظام انتہائی سخت تھا جہاں زمینداروں کا کاشتکاروں سے تعلق صرف لگان کی وصولی تک محدود تھا اور یہ رؤسا اپنے سے کم تر لوگوں پر سختی سے حکومت کرتے تھے۔ ایک واقعہ جس نے ان کے چھوٹے بھائی انصار الحق ہروانی کی زندگی کو متاثر کیا وہ ردولی کے میلے کا تھا جب

ایک زمیندار چچا نے پالکی اٹھانے والے غریب کہار کو صرف دیر سے آنے پر کوڑوں سے مارا۔ یہ جا گیردارانہ استحصال کا منظر انصار الحق ہروانی کے سیاسی شعور کی بیداری کا سبب بنا۔

حمیدہ سالم کے بہن بھائیوں کی زندگی ان کے خاندان کے ادبی اور سیاسی ورثے کی ترجمان تھی۔ بڑے بھائی اسرارالحق مجاز (پیدائش 1911) علی گڑھ کے سنہرے ادبی دور کی ایک اہم شخصیت تھے جن کی شاعری ترقی پسند تحریک کے زیراثر پروان چڑھی۔ وہ ایک پرکشش اور حساس شاعر تھے لیکن ان کی زندگی کا المناک پہلو ایک شادی شدہ لڑکی سے ناکام محبت تھی جس نے انھیں شراب نوشی کی لت میں مبتلا کر دیا اور بالآخران کی موت کا سبب بنی۔

بقول حمیدہ سالم:

''اسرار بھائی کی محرومیاں بڑھتی گئیں۔ پریشانی و پشیمانی میں اضافہ ہوتا گیا۔ زندگی کی تلخی کو شراب کی تلخی میں ڈبوتے رہے ہر لعن طعن نصیحت کو خاموشی سے سنتے رہے ایک کرب کا عالم ایک انتشار کی کیفیت ایسا لگتا تھا جیسے زندگی ان کے پیچھے بھاگ رہی ہو اور وہ زندگی سے بھاگ رہے ہوں اس تنگ دور میں سہارا تھا تو صرف شراب کا اچھی ہو یا بری اس سے مطلب نہیں مخلص اور چاہنے والے دوست سمجھانے کی کوشش کرتے وہ اپنے فطری ہنر سنجیدہ گفتگو کو غیر سنجیدہ بنانے سے کام لیتے دوسرے تو ہنس پڑتے بات ٹل جاتی ان کے لبوں پر ایک افسردہ سی مسکراہٹ ہوتی۔''2

حمیدہ سالم نے یہ تلخ حقیقت اپنے مضمون 'جگن بھیا' میں ایمانداری سے بیان کی۔ دوسرے بھائی انصار الحق ہروانی (پیدائش 1914) کا رجحان بچپن سے ہی سیاست کی طرف تھا وہ کم عمری میں ہی گاندھی جی، نہرو اور دیگر بڑے سیاسی لیڈروں سے ملے اور تحریک آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا جس کی وجہ سے وہ کئی بار جیل بھی گئے۔ ان کی انگریزی کتاب 'Before Freedom and After' ان کی سیاسی جدوجہد کی عکاسی کرتی ہے۔ تاہم آزادی کے بعد کے مسائل نے ان کی زندگی کو بھی متاثر کیا۔

ان کی بڑی بہن صفیہ اختر ایک روشن خیال، ذہین اور ہونہار خاتون تھیں جنہیں حمیدہ سالم اپنا آئیڈیل مانتی تھیں۔ صفیہ نے قدامت پسند معاشرتی رکاوٹوں کو پیچھے چھوڑ کر علی گڑھ سے تعلیم مکمل کی اور لیڈی سپروائزری کی ملازمت اختیار کی جسے انھوں نے اپنے شوہر اختر صاحب کے مالی حالات کی وجہ سے آخر تک برقرار رکھا۔ ان کے خطوط کے مجموعے 'زیر لب' اور 'حرف آشنا' شائع ہو چکے ہیں۔ حمیدہ سالم نے صفیہ کی جدوجہد پر اپنے بھانجے جاوید اختر کے نام ایک مفصل خط بھی لکھا جو ان کی بہنوں سے گہری محبت اور تعلق کو ظاہر کرتا ہے۔ جس کا تذکرہ خلیق انجم نے حمیدہ سالم کی کتاب 'ہم ساتھ تھے' میں بڑی خوبصورتی سے کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

''صفیہ ٹریننگ کالج میں لیڈی سپروائزر کے عہدے پر فائز رہیں ان کی پرورش ایک روایتی جاگیردار خاندان میں ہوئی۔ لیکن وہ غیر معمولی ذہین خاتون ہی نہیں تھیں بلکہ حیرت انگیز حد تک روشن خیال، ترقی پسند اور آزاد خیال تھیں۔ انھیں خود پر بہت اعتماد تھا۔ صفیہ با قاعدہ ادیب نہیں تھیں لیکن ان کے خطوط کا مجموعہ 'زیر لب' ان کی کتاب 'حرف آشنا' اردو ادب کا بیش بہا خزانہ ہے۔ صفیہ اختر نے راہ وفا پر جانے کتنی ٹھوکریں کھائیں، کتنی چوٹیں اٹھائیں، لیکن کبھی ہمت نہ ہاریں' صفیہ ہمیشہ تازہ دم رہیں ان کے عزم، حوصلے توانائی اور دوراندیشی کا سب سے بڑا ثبوت اردو کے مشہور اور ممتاز شاعر جاوید اختر ہیں۔''3

شادی کے بعد حمیدہ سالم نے سولہ سال بیرون ملک گزارے اور ان کی خودنوشت میں خرطوم (سوڈان)، انگلینڈ، ایتھوپیا اور جدہ کے اسفار اور مشاہدات کا تفصیلی ذکر ملتا ہے۔ مصنفہ حمیدہ سالم نے سوڈان کے دارالحکومت، خرطوم کی ثقافت اور طرزِ زندگی کو نہایت دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔ وہ بتاتی ہیں کہ وہاں بیٹیوں کی ولادت پر اس قدر افسوس نہیں کیا جاتا تھا جتنا کہ بیٹوں کی پیدائش پر کیا جاتا ہے۔ بیٹی پیدا ہونے پر لوگ ایسے جشن مناتے تھے جیسے برصغیر پاک و ہند میں بیٹا پیدا ہونے پر منایا جاتا ہے۔ جہیز اور شادی

بیاہ کے معاملات بھی منفرد تھے۔شادی کی تمام تر تیاریاں اور اخراجات کی ذمہ داری لڑکے کا خاندان اٹھاتا تھا۔ یہاں تک کہ لڑکی کے خاندان کی ذمہ داریاں بھی منگیتر کے گھر والے ہی پوری کرتے تھے۔

خرطوم کی ایک اور اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہاں کے باشندے عبادات (نماز اور روزہ) کی پابندی کا بہت زیادہ خیال رکھتے ہیں جس کا مشاہدہ ہندوستان میں کم ہوتا ہے۔ اذان کی آواز سنتے ہی لوگ فوراً نماز ادا کرنے لگتے تھے خواہ وہ سڑک کے کنارے ہوں یا کسی کھلی جگہ پر۔

حمیدہ سالم کی فنی مہارت کا تجزیہ کرتے ہوئے سب سے پہلے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان کے ہاں خالص تخلیقی دیانت اور باطنی سچائی کی وہ قوت کارفرما ہے جو ہر بڑے شاہکار کی بنیاد ہوتی ہے۔ ان کی تحریریں کسی مخصوص فکری دھارے کی گروہ یا نظریے کی پابند نہیں بلکہ ان کا فن ذاتی مشاہدے اور دنیا سے حاصل کردہ تجربات کا نتیجہ ہے۔ یہ خلوص ہی ان کے کام کو حقیقت کا رنگ دیتا ہے۔

تنقیدی نگاہ سے دیکھا جائے تو حمیدہ سالم کی نثری تخلیقات اردو ادب میں خاکہ نگاری اور ذاتی یادداشتوں کے بیچ ایک منفرد اسلوب اختیار کرتی ہیں۔ ان کے پیش کردہ خاکوں میں نہ تو روایتی خاکہ نویسوں جیسی خالص ظرافت حاوی ہے اور نہ ہی وہ محض تاثراتی خاکے ہیں۔ وہ ہر کردار کو ایک مکمل انسانی پیکر کے طور پر پیش کرتی ہیں اس کی خوبیاں اس کی کمزوریاں اس کے مقاصد اور اس کے خوف سب ایک ساتھ انسانی وجود کا یہی متوازن اظہار ان کے فن کی سب سے نمایاں پہچان ہے۔

اس کے بعد حمیدہ سالم انگلینڈ کے لیے روانہ ہوگئیں اور وہاں سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد انھوں نے ایتھوپیا کا سفر کیا جو ہمیشہ آزاد رہا۔ انھوں نے وہاں کے انوکھے کلینڈر کا ذکر کیا، جہاں سال میں تیرہ مہینے ہوتے ہیں اور سال کا آغاز جنوری سے نہیں بلکہ ستمبر سے ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے وقت کے تعین اور ایسٹر کو کرسمس سے زیادہ اہمیت دینے کی روایت کو بھی بیان کیا۔ جدہ کے سفر میں انہیں عورتوں کے اکیلے سفر کرنے پر عائد پابندیوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن اس سفر کا اختتام حرم شریف کی حاضری اور روحانی سکون پر ہوا جوان کی کہانی کو ایک فکری تکمیل دیتا ہے۔

حمیدہ سالم کی تحریروں کا جائزہ لینے پر معلوم ہوتا ہے کہ ان کا اسلوب بہت آسان ہے۔ انھوں نے برجستہ لکھا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں مصنوعی پن کا کوئی شائبہ نہیں ملتا۔ اس سادگی کی ایک ممکنہ وجہ یہ ہے کہ حمیدہ سالم نے اقتصادیات کی تعلیم حاصل کی تھی۔ اگرچہ انھوں نے اردو میں مختصر کام کیا ہے لیکن ان کا جو بھی ادبی سرمایہ ہے وہ قابلِ تعریف اور عمومی طور پر پسند کیا جاتا ہے۔

حمیدہ سالم کے لٹریچر کا سب سے اہم فکری اور معاشرتی اصلاحی رخ عورتوں کی تعلیم کے لیے ان کی کوششوں کا احاطہ کرتا ہے۔ ان کا اور ان کی بہن صفیہ جاں نثار اختر کا علم حاصل کرنے کا قصہ، اس زمانے کے مسلم سماج میں لڑکیوں کو چوکھٹ سے باہر نکال کر یونیورسٹی کی تعلیم دلوانے کے خلاف پائی جانے والی سخت سماجی رکاوٹوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ ان کے بھائیوں کی یہ شدید تمنا تھی کہ ان کی بہنیں اعلیٰ علمی مدارج طے کریں۔ حمیدہ سالم کی تعلیم کو دو مختلف مراحل میں بانٹا جا سکتا ہے ایک کو علی گڑھ میں اسکول کی سطح کی پڑھائی، اور دوسرا لکھنؤ کے آئی ٹی کالج میں یونیورسٹی کی تعلیم کا زمانہ۔ آئی ٹی کالج میں داخلہ لینا جدید سوچ اور پرانی روایات کے درمیان سب سے بڑا اصولی اختلاف بن گیا کیونکہ وہاں پردے کی کوئی سہولت نہیں تھی اور لڑکے اور لڑکیاں مشترکہ طور پر تعلیم حاصل کر سکتے تھے۔ اہل خانہ اس کے مقابلے میں کرامت حسین کالج کو زیادہ مناسب سمجھ رہے تھے، جو پردہ داری کے اعتبار سے بہتر تھا اور صرف خواتین کے لیے مختص تھا۔ یہ وہ نازک لمحہ تھا جہاں ان کے بھائی انصار الحق ہروانی نے اپنی روشن خیالی اور آزادانہ نظریات کا ٹھوس ثبوت پیش کیا۔ انھوں نے خاندان کی جھجک کے باوجود کالج کے پرنسپل سے مل کر ان کا داخلہ مکمل کروایا۔ ان کے خاندان کے افراد کی کہانی ان کی تحریروں میں ایک ذاتی اور ادبی رنگ بھرتی ہے۔ رومانی شاعر اسرار الحق مجاز کی فطرت، جس میں وہ نہایت مہربان مگر خودداری سے عاری تھے، ان کی ادبی شخصیت کے اندرونی ٹکراؤ کو

نمایاں کرتی ہے۔ انھوں نے شاعری کے میدان میں شہرت تو حاصل کی، لیکن محبت میں ناکامی کے شدید دکھ نے انہیں شراب کی عادت میں مبتلا کر دیا اور وہ ریڈیو کی ملازمت بھی چھوڑ بیٹھے۔ یہ واقعہ ایک حساس فنکار کے جذباتی انتشار اور پستی کی داستان ہے۔

ان کے دوسرے بھائی انصار الحق ہروانی کا سیاسی رجحان اور اندرا گاندھی اور فیروز گاندھی کی شادی میں ان کا اہم حصہ، خاندان کی سیاسی طور پر فعال اور باشعور فضا کا بھرپور ثبوت ہے۔ ان کی بہن صفیہ جاں نثار اختر کا بی اے، بی ٹی اور ایم اے کی ڈگریاں حاصل کرنا اس خاندان کی تعلیم کے حصول کے لیے پختہ عزم کی سب سے بڑی مثال ہے۔ ان کی کتابیں، "زیرِلب" اور "حرف آشنا" ادبی حلقوں میں ایک خاص شناخت رکھتی ہیں۔

تکنیکی پہلو سے دیکھا جائے تو حمیدہ سالم کی تحریروں کی سب سے بڑی خوبی ان کا باریک بینی سے مشاہدہ کرنا اور ان کا سادہ اور مسلسل بہاؤ رکھنے والا اندازِ بیان ہے۔ یہ خاص طور پر ان کے سفرناموں میں جھلکتا ہے کیونکہ انھوں نے شادی کے بعد سولہ سال بیرون ملک گزارے سوڈان (خرطوم) اور ایتھوپیا کے حالات کی روداد ان کی گہری مشاہداتی صلاحیت کو بیان کرتی ہے۔ خرطوم میں ہاتھی کی سونڈ کے متعلق مقامی وضاحت پر وہ تبصرہ کرتی ہیں کہ "میں کم از کم اس مماثلت کا اندازہ نہیں لگا سکی اور اس طرح ایک غیر جذباتی اور حقیقت پسندانہ رویہ پیش کرتی ہیں۔ وہ وہاں کی ثقافت کا ذکر کرتی ہیں جیسے مردوں کا لباس "جلیبا"، خواتین کی چادر "ٹوپ" اور خاص طور پر شادی کی رسومات کا بھی تذکرہ کرتی ہیں۔

حمیدہ سالم کی ادبی سمجھ بوجھ بہت چھوٹی عمر میں پروان چڑھ گئی۔ ان کا تعلق ایک ایسے پڑھے لکھے اور دانشور خاندان سے تھا جہاں کی فضا میں غور و فکر، مطالعہ اور بحث و مباحثے کی مہک رچی بسی تھی۔ گھر میں مجاز جیسے شاعر انصار الحق ہروانی جیسے فلسفی اور صفیہ جاں نثار اختر جیسی نازک خیال مصنفہ کی موجودگی نے ان کی سوچ اور جذبات کو پختگی عطا کی۔ یہ ماحول مسلسل ان کے اندر مشاہدہ کرنے اور اظہار خیال کرنے کا شوق ابھارتا رہا۔ ان کا بچپن کتابوں، نظموں اور تبادلۂ خیال کے درمیان گزرا۔ بات چیت کا لہجہ دھیما مگر بہت گہری بات کہنے والا تھا۔

ان کی تحریروں میں خواتین کے اندرونی جذبات ان کی پریشانیاں اور فکری آزادی کا احساس واضح طور پر ابھرتا ہے۔ وہ عورت کے لیے کسی بناوٹی عزت یا جذباتی ہمدردی کی حمایت نہیں کرتی تھیں بلکہ اسے ایک باوقار اور سمجھدار ہستی کے طور پر دیکھتی تھیں۔ حمیدہ سالم کے نزدیک عورت کی حقیقی قوت اس کی ذہنی خود مختاری اور اخلاقی مضبوطی میں ہے۔ یہ سوچ ان کے افسانوی اور شخصی خاکوں میں نمایاں ہے۔

ان کی نثر میں ایک قسم کی تازگی اور خود اعتمادی محسوس ہوتی ہے۔ بعض جگہ دیہات کی زبان کی شیرینی اور کہیں لکھنؤ کی تہذیبی نزاکت ان کے جملوں کو جلا بخشتی ہے۔ ان کے مشاہدات روزمرہ زندگی سے جڑے ہوئے ہیں۔ وہ اپنے اردگرد کے افراد کی فطرت ان کے برتاؤ اور ان کے تضادات کو پوری وضاحت سے دیکھتی ہیں۔ ان کی تحریروں میں طنز بھی موجود ہے لیکن وہ تلخ نہیں ہوتا بلکہ ایک شائستگی کے ساتھ سماجی سچائیوں کو ظاہر کرتا ہے۔

حمیدہ سالم کی یہ خودنوشتیں نہ صرف ان کی ذاتی داستان ہیں بلکہ بیسویں صدی کے وسطیٰ ہندوستان کے ادبی سیاسی اور سماجی تناظر کو سمجھنے کے لیے ایک ضروری ماخذ ہیں جو ایک سادہ لیکن مضبوط مشاہدہ کرنے والی خاتون کے قلم سے وجود میں آیا۔ حمیدہ سالم کا ادبی سفر پوشیدہ لیکن اثر انگیز رہا۔ انھوں نے کسی مہم یا گروہ کی حمایت کے بغیر بلکہ اپنی دانشوری اور تحریر کی طاقت کے بل بوتے پر اپنی جگہ بنائی۔ ان کے کام آج بھی اس حقیقت کی گواہی دیتے ہیں کہ اگر اندازِ بیاں ایماندار ہو تو الفاظ ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔

حمیدہ سالم کی تخلیقات اپنے وقت کی فکری اور ثقافتی حالات کی عکاسی کرتی ہیں۔ ان کی نگارشات میں ایک طرف اس دور کی بے قراری اور بدلتے ہوئے معاشرتی رجحانات ظاہر ہوتے ہیں تو دوسری طرف ایک گہرا انسانی کرب اور زندگی کے مقصد کو سمجھنے کی تلاش دکھائی دیتی ہے۔ انھوں نے کم لکھا مگر جو کچھ بھی لکھا سچائی اور

دیانتداری کے ساتھ لکھا۔ ان کی مشہور کتاب 'ہم ساتھ تھے' ہے جو کہ ذاتی یادوں اور شخصی خاکوں کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس میں انھوں نے نہ صرف اپنے دور کے افراد کو بیان کیا بلکہ ان کی شخصیات کے ذریعے ایک پورے عہد کی روح کو محفوظ کر لیا۔ یہ کتاب محض پرانی باتوں کا ذخیرہ نہیں ہے بلکہ ایک تہذیبی ریکارڈ ہے۔ اس میں ان کا مشاہدہ بہت گہرا اور طریقۂ بیان نرم اور مؤثر ہے۔ ان کے خاکوں میں لوگوں کی عادات، ان کی نرم دلی یہاں تک کہ ان کی خاموشیاں بھی زندہ ہو اٹھتی ہیں۔

ان کی تحریروں میں ایک تہذیبی حسرت اور دردمندی کا عنصر بھی گہرا ہے۔ وہ ان تبدیلیوں کو شدت سے محسوس کرتی ہیں جو سماجی ڈھانچے اور خاندانی نظام میں رفتہ رفتہ آ رہی تھیں۔ تاہم، وہ اس تبدیلی کو محض تنزل کے طور پر نہیں دیکھتیں بلکہ اسے زندگی کا ایک فطری عمل سمجھتے ہوئے اس کے پردے میں چھپی انسانی کہانیوں کی کھوج کرتی ہیں۔ اس اعتبار سے ان کی نثر محض ماضی کی داستان نہیں بلکہ حال کا پرخلوص تجزیہ بھی ہے۔

تنقید کے نقطہ نظر سے ان کی طرزِ تحریر کی سب سے بڑی خوبی اعتدال پسندی اور نفاست ہے۔ وہ طعن و تشنیع اور جذباتی مبالغے سے پرہیز کرتی ہیں لیکن ان کے کلام میں تاثیر کی کمی ہرگز نہیں ہوتی۔ وہ احساسات کو سطحی شدت کے بجائے گہری معنویت کے ساتھ پیش کرتی ہیں۔ یہی گہرائی پڑھنے والے کو غور و فکر پر مجبور کرتی ہے۔ ان کی سادہ زبان میں بھی ایک خاص فنی حسن پایا جاتا ہے۔ وہ مشکل الفاظ کا سہارا لینے کے بجائے ایسے لفظوں کا انتخاب کرتی ہیں جو دل سے نکلیں اور دل تک پہنچیں۔ اسی بنا پر ان کی تحریریں بظاہر سادہ محسوس ہوتی ہیں مگر ان کے اندر معنویت کی کئی پوشیدہ پرتیں ہوتی ہیں۔

ان کے فن کا ایک اور اہم پہلو نسوانی شعور کی موجودگی ہے۔ مگر یہ نسائیت کسی نظریاتی منشور یا احتجاجی لب و لہجے کے بجائے انسانی تجربے کی وسعت میں ظاہر ہوتی ہے۔ وہ عورت کو ایک انسان کی حیثیت سے دیکھتی ہیں اس کی نرمی اور اس کے حوصلے دونوں کو یکساں عزت دیتی ہیں۔ یہی منصفانہ رویہ ان کے فن کو توازن اور وقار بخشتا ہے۔ اگر اردو نثر کی تاریخ میں ان کی جگہ مقرر کی جائے تو وہ باطنی تجربے اور ظاہری سادگی کی ترجمان ادیبہ کے طور پر ابھرتی ہیں۔ ان کے ہاں ادب کا مقصد محض اظہارِ خیال نہیں بلکہ احساسات کا تحفظ ہے۔ یعنی وہ جذبات اور رشتوں کو قلم کی مدد سے محفوظ کر لیتی ہیں جیسے کوئی قیمتی یادگار سنبھال کر رکھی جاتی ہو۔ وہ ادب کو اخلاقی تعلیم دینے کے لیے نہیں بلکہ انسان کو بہتر انسان بنانے کے لیے استعمال کرتی ہیں۔ یہی ان کے فن کی سب سے پائیدار خصوصیت ہے۔

ان کے فن کا ایک اور اہم نکتہ یہ ہے کہ وہ رپورتاژ اور خاکہ کے درمیان کی حدود کو دھندلا دیتی ہیں۔ وہ واقعات کو اس طرح بیان کرتی ہیں کہ قاری خود کو ان کا حصہ محسوس کرنے لگتا ہے۔ یہی خالص تخلیقی شفافیت ان کے فن کو محض واقعہ نگاری نہیں بلکہ مشترکہ تجربے کا تسلسل بنا دیتی ہے۔

تنقیدی طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ حمیدہ سالم نے اردو نثر میں احساساتی اور اخلاقی آگہی کی ایک ایسی جہت شامل کی جو مکمل طور پر ان کی اپنی شناخت ہے۔

حواشی

1 حمیدہ سالم، شورش دوراں، ص24، 1995، ادب پبلی کیشنز، دہلی

2 حمیدہ سالم، شورش دوراں، ص20، 1995، ادب پبلی کیشنز، دہلی

3 خلیق انجم حرف آغاز (ہم ساتھ تھے) ص 11، 12، 1999 انجمن ترقی اردو (ہند)، دہلی

4 خلیق انجم حرف آغاز (ہم ساتھ تھے) ص، 12، 14، 16، 1999، انجمن ترقی اردو (ہند)، دہلی

5 حمیدہ سالم، شورش دوراں، ص210،، 1995، ادب پبلی کیشنز، دہلی

□□□

Farheen Khanam
Department of Urdu
Assam University
Girls Hostel .1Block,
C Room No 28,
Silchar-788011 (Assam)
fkhanam599@gmail.com

سبزار سکندر سہہ

فاطمہ بیگم پروین کی تنقیدی خدمات

حیدرآباد ابتدا سے علم و عرفان، تہذیب و ثقافت کی لطیف روایات اور اردو زبان و ادب کا مرکز رہا ہے۔ اس شہر کے مقدر میں علمی وقار، ادبی رفعت اور تحقیقی عظمت ہمیشہ سے رہی ہے۔ اردو ادب کے کئی نامور شعرا و ادبا اور ناقدین و محققین کا اس سرزمین سے تعلق رہا ہے جنھوں نے اپنی فکری بلندی، تخلیقی توانائی اور تحقیقی اُپج سے اردو ادب کو نئی جہتیں عطا کیں۔ یہی سبب ہے کہ حیدرآباد آج بھی اہل ادب کے لیے ایک روشن حوالہ اور ادبی وراثت کا معتبر گہوارہ ہے۔ حیدرآباد سے تعلق رکھنے والا ایسا ہی ایک اہم نام فاطمہ بیگم پروین بھی ہے۔

فاطمہ بیگم پروین (1953-2021) جن کا اصل نام فاطمہ بیگم تھا، کی ولادت حیدرآباد میں ہوئی۔ ان کے والدین کا تعلق ایک ادبی اور علمی گھرانے سے تھا اور اسی ادبی و علمی ماحول میں فاطمہ بیگم پروین کی بھی پرورش ہوئی۔ ایم۔اے اردو میں گولڈ میڈل حاصل کرنے کے بعد انھوں نے 'سترہویں صدی کی دکنی شاعری' پر مقالہ لکھ کر ایم۔فل (1979) اور 'غواصی کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ' کے زیر عنوان مقالہ لکھ کر پی ایچ۔ڈی (1989) کی ڈگریاں حاصل کیں۔ تدریسی خدمات کا آغاز انھوں نے جونیئر لکچرر کی حیثیت سے کیا، 1990 میں ان کا تقرر عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں بحیثیت لیکچرر ہوا، 1997 میں ریڈر اور 2005 میں پروفیسر کے عہدے پر فائز ہوئیں۔ ایک اعلیٰ پایہ مدرس ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک نہایت شائستہ، خوش اخلاق اور ہمدرد خاتون تھیں۔

فاطمہ بیگم پروین ایک اچھی نثر نگار ہونے کے ساتھ ساتھ مترجم، محقق اور نقاد بھی تھیں لیکن دکنی ادب کے ساتھ ان کو زیادہ لگاؤ تھا۔ ان کی مرتب و ترجمہ کی ہوئی کتابوں اور اُن کی تصانیف میں 'اختر انصاری کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ' (1980)، 'کربِ کربلا' (1982)، 'زاویۂ نگاہ' (2004)، 'ننھی نظمیں (تلگو سے ترجمہ)' (2005)، 'کلاسیکی شاعری کا مطالعہ' (2006)، 'اردو زبان و ادب، تہذیبی اقدار کا تحفظ اور خواتین' (2008)، 'اشکِ غم (مرتب)' (2010)، 'پروفیسر مغنی تبسم: ایک روشن چراغ تھا نہ رہا' (2014)، 'دکنی ادب کا مطالعہ' (2019) اور 'دکن اور ہند اسلامی تہذیب' (2020) شامل ہیں۔ ان کتابوں کے علاوہ انھوں نے لاتعداد مضامین اور تبصرے لکھے جو ملک کے مختلف رسالوں، مجلوں اور اخباروں میں شائع ہوئے۔ ان کے ادبی مقام کے اعتراف میں آندھرا پردیش اردو اکادمی اور مغربی بنگال اردو اکادمی نے انھیں انعامات سے نوازا۔

فاطمہ بیگم پروین نے مختلف موضوعات، اصناف اور شخصیات پر خامہ فرسائی کی۔ خسرو، میر، مصحفی، غالب، انیس اور دبیر کے فن پر انھوں نے تفصیلی مضامین ضبط تحریر میں لائیں۔ یہ مضامین ان کی

کتاب ’’کلاسیکی شاعری کا مطالعہ‘‘ میں شامل ہیں۔ ان کو غالب میں ایک اچھا شاعر اور نثار تو نظر آتا ہی ہے ساتھ میں ان کی شخصیت میں غیر معمولی صلاحیتیں، وسیع دل اور روشن ذہن بھی نظر آتا ہے اور اس ذہنی روشنی نے غالب کو زماں و مکاں کی قیود سے آزاد کیا۔ چنانچہ وہ اپنے مضمون ’’غالب اور روشن خیالی‘‘ میں لکھتی ہیں:

’’مرزا اسد اللہ خاں غالب، اُردو زبان کے شاعر اور نثار، روشن ذہن، وسیع دل اور غیر معمولی صلاحتوں کے حامل انسان گزرے ہیں۔ مرزا نے اپنی ذہنی روشنی کو الفاظ کے ذریعہ کچھ اس طور پر پیش کیا کہ زماں و مکاں کی قیود سے آزاد ہوگئے۔ خود کے دور کو بھی راہ دکھائی اور صدیوں کے فاصلے کو طے کرتے ہوئے نسل در نسل اپنے کو اہمیت کا حامل تسلیم کرنے پر مجبور کردیا۔‘‘

(کلاسیکی شاعری کا مطالعہ، ڈاکٹر فاطمہ بیگم پروین، 2009، تخلیق کار پبلیشرز دہلی، ص49)

فاطمہ بیگم پروین نے نہ صرف صنف ’مرثیہ میں تہذیبی عناصر‘ کو دیکھنے کی کوشش کی ہے بلکہ اس میدان کے دو بڑے شہسواروں انیس اور دبیر کے مرثیوں کی فنی خصوصیات کا جائزہ بھی لیا اور ان دونوں کا تقابلی مطالعہ بھی کیا ہے، جس کی مثالیں ’انیس: بحثیت مرثیہ نگار‘، ’مرزا دبیر کی مرثیہ نگاری کی فنی خصوصیات و روایت نگاری‘، ’اردو مراثی میں تہذیبی عناصر‘ اور ’انیس اور دبیر کا تقابلی مطالعہ‘ ہیں۔ آخر الذکر مضمون میں پروفیسر فاطمہ پروین بیگم متذکرہ دونوں شاعروں کا تقابل کرتے ہوئے یہ بات سامنے لائی ہیں کہ دونوں کا رنگ جداگانہ ہے۔ میر انیس کے یہاں دہلوی اور لکھنوی دبستان کی صالح اور مستحکم روایت ملتی ہے۔ جبکہ مرزا دبیر کے پاس لکھنوی دبستان کا رنگ بھرپور اور چمکتا ہوا ملتا ہے۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں کا رنگ و آہنگ مختلف ہے ساتھ ہی اسلوب میں بھی فرق واضح نظر آتا ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

’’میر انیس نے اپنے لیے ایک راہ کا انتخاب کیا اور مرزا دبیر نے دوسرے طریقۂ اظہار کو اپنے لیے مناسب سمجھا۔ میر انیس نے دہلوی اور لکھنوئی دبستان کی صالح روایات کے امتزاج سے اپنے لہجہ کی تشکیل کی اور مرزا دبیر کے پاس لکھنوی دبستان کا رنگ گہرا اور نکھرا ہوا ملتا ہے۔ اس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان دونوں کا رنگ سخن جداگانہ ہے، دونوں کا اُسلوب مختلف ہے۔‘‘

(کلاسیکی شاعری کا مطالعہ، ڈاکٹر فاطمہ بیگم پروین، 2009 تخلیق کار پبلیشرز دہلی، ص122)

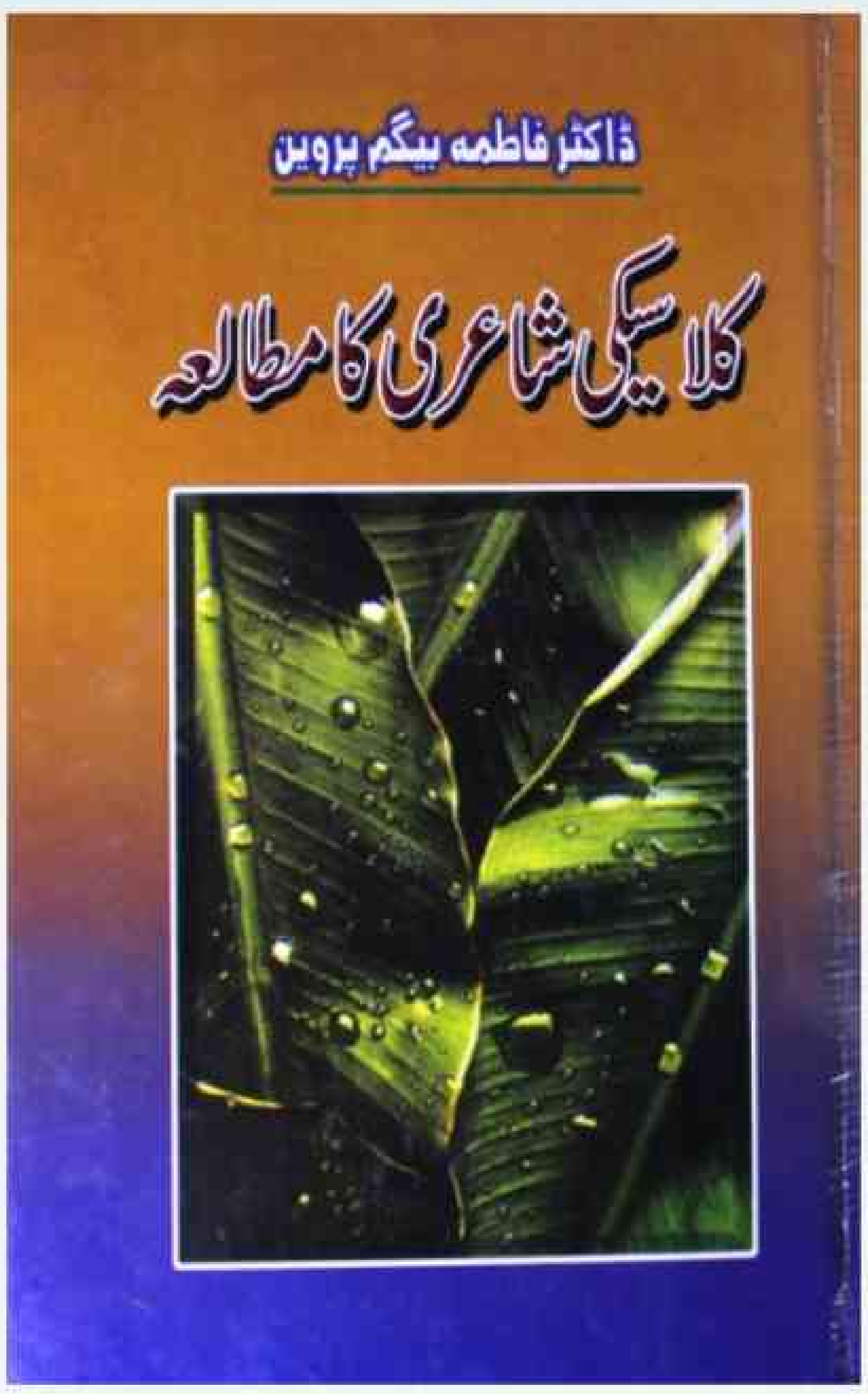

پروفیسر فاطمہ بیگم پروین کی کتاب ’دکنی ادب ایک مطالعہ‘ میں انھوں نے دکن کے سلاطین کی ادبی خدمات اور دکنی کے شعرا پر مضامین تحریر کیے ہیں۔ اس کتاب میں انھوں نے سلطان محمد قلی قطب شاہ سے لے کر ولی دکنی اور سراج اورنگ آبادی تک مختلف شعراء پر خامہ فرسائی کی ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اردو ادب کے پہلے صاحب دیوان شاعر سلطان محمد قلی قطب شاہ فارسی شاعری سے پوری واقفیت رکھتے تھے۔ انھوں نے کئی غزلوں کا دکنی زبان میں ترجمہ کر کے حافظ کا نام دکن میں بھی زندہ جاوید کردیا۔ ان کی شاعری میں انوری، خاقانی، نظامی، عنصری اور ظہیر فاریابی جیسے اعلیٰ پایہ شاعروں کا نام بھی آتا ہے۔ جو ترجمہ

انھوں نے فارسی غزلوں کا کیا وہ ترجمہ کامیاب رہا اور بے حد پسند کیا گیا۔ یہ اس دور کی بات ہے جب اردو کو اتنی شہرت ، وسعت اور پختگی حاصل نہیں ہوئی تھی جتنی آج کے دور میں ہے ، یوں کہیں کہ اردو کا ابتدائی زمانہ تھا۔ محمد قلی قطب شاہ کی قابلیت کی دلیل یہ ہے کہ انھوں نے مشکل سے مشکل موضوع کو اپنی شعری وجدان سے دکنی زبان میں لاکر آسان بنادیا۔ چونکہ فاطمہ بیگم پروین لکھتی ہیں:

’’ اُردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر سلطان محمد قلی قطب شاہ کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فارسی شاعری سے پوری طرح واقف تھا حافظ شیرازی کا اس کی شاعری پر اثر واضح ہے۔ انوری، خاقانی، نظامی، عنصری اور ظہیر فاریابی کے نام بھی اس کی شاعری میں آتے ہیں۔ اس کی پچاسوں غزلیں تو حافظ کی غزلوں کا دکنی ترجمہ ہی ہیں اور یہ ترجمہ نہایت کامیاب سمجھا جاسکتا ہے۔ اس زمانہ میں جب کہ اردو کو اتنی وسعت اور پختگی حاصل نہیں ہوئی تھی جتنی اب ہے لیکن یہ محمد قلی کی زبردست شاعرانہ قوت اور غیر معمولی موزونی طبع کی دلیل ہے کہ اس نے حافظ کے جملہ مشکل سے مشکل مضامین کو دکنی میں منتقل کرلیا۔‘‘

(’’دکنی ادب ایک مطالعہ‘‘، پروفیسر فاطمہ بیگم پروین، 2019، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ص 49)

غواصی کے کلام کا جائزہ لیتے ہوئے پروفیسر فاطمہ بیگم پروین نے اپنی کتاب میں چند ایسے مشاہدات درج کیے ہیں جو ان کی فارسی لسانیات اور ادبی روایت پر گہری نظر کا ثبوت ہیں۔ ان کے مطابق فارسی زبان میں محبوب کا صنفی امتیاز موجود نہیں ہوتا، اسی وجہ سے وہاں محبوب کو عام طور پر مذکر تصور کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس دکنی ادب میں تذکیر و تانیث کا فرق نمایاں ہے، یہاں کے شعراء نے اپنے عشقیہ اشعار میں محبوب کی جنس واضح کرنے کے لیے متعدد الفاظ استعمال کیے ہیں۔ سجن، نار، ناری، موہنی جیسے الفاظ اس بات کو نمایاں کرتے ہیں کہ ان کا محبوب دراصل محبوبہ ہے۔ غواصی کی شاعری میں بھی معشوق کا تصور پوری صفائی اور حسنِ بیان کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ انھوں نے اپنی محبوبہ کے لیے نہایت دل آویز اور موزوں الفاظ اختیار کیے ہیں۔ فاطمہ بیگم پروین لکھتی ہیں کہ:

’’ فارسی میں چونکہ مذکر اور مونث کی تفریق نہیں ہوتی اسی لیے وہاں محبوب کو مذکر باندھا جاتا ہے۔ جبکہ دکنی میں مذکر اور مونث میں فرق پایا جاتا ہے۔ دکنی شعرا نے اپنی غزلوں میں اپنی محبوب کی جنس کا واضح تعین کیا ہے وہ اپنے محبوب کے لیے سجن ، نار، ناری، موہنی اس قسم کے الفاظ استعمال کرتے ہیں جس سے پتہ چل جاتا کہ ان کا محبوب نہیں بلکہ محبوبہ ہے۔‘‘

(’’دکنی ادب ایک مطالعہ‘‘، پروفیسر فاطمہ بیگم پروین، 2019، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ص 169)

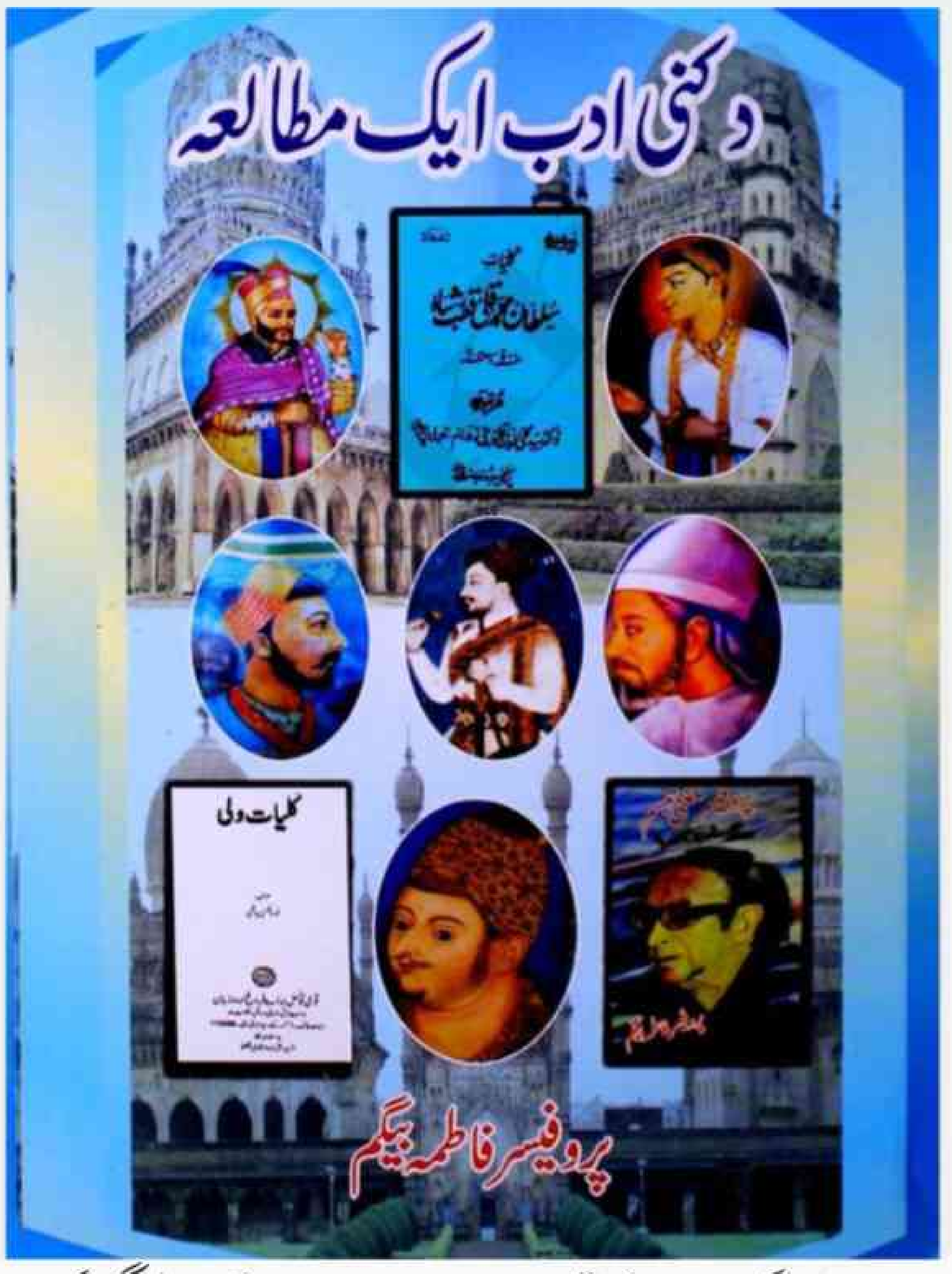

فاطمہ بیگم پروین کی تحریروں کے ذریعے ان کی وابستگی اگرچہ زیادہ تر دکنی زبان و ادب کے ساتھ معلوم ہوتی ہے لیکن انھوں نے ’مہاتما گاندھی، قومی زبان اور اردو شاعری‘، ’مولوی عبدالحق کا تنقیدی شعور‘، ’ڈاکٹر زور کی افسانہ نگاری: ایک مطالعہ‘، ’مخدوم کی نظم نگاری‘ اور ’اردو اور قومی اتحاد‘ جیسے مضامین لکھ کر اردو ادب کے مختلف

گوشوں کو بھی واضح کیا ہے۔ جو ان کے مجموعۂ مضامین ’زاویۂ نگاہ‘ میں شامل ہیں۔ ’اردو اور قومی اتحاد‘ مضمون میں جہاں انھوں نے قدیم اور کلاسیکی شعراء کی شاعری میں قومی اتحاد و یکجہتی کو دیکھنے کی کوشش کی ہے وہیں ان کو ترقی پسند شعرا کی شاعری میں یہ نظر آتا ہے کہ غلامی اور فرقہ پرستی آزادی اور قومی یکجہتی کے لیے مہلک ہے۔ جوش کی شاعری کے مطالعے کے بعد وہ لکھتی ہیں:

’’جوش غلامی سے نفرت کرتے ہیں۔ فرقہ پرستی انھیں ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ محبت ان کا مذہب ہے۔ انسان دوستی پر وہ ایمان رکھتے ہیں۔ خیر ہی ان کے نزدیک سب کچھ ہے شر کی ان کے یہاں کوئی جگہ نہیں ہے۔ وہ ایسی زندگی کو برداشت نہیں کر سکتے۔ ایسا ماحول انھیں گوارا نہیں ہے جس میں آزادی اور مساوات کا کوئی تصور نہ ہو۔ ان کا تصور انقلاب، انھیں حالات کی پیداوار ہے۔‘‘

(’’زاویۂ نگاہ‘‘، ڈاکٹر فاطمہ بیگم پروین، مکتبۂ شعر و حکمت، حیدرآباد جنوری 2013، ص 75)

انسانی ذہن ہمیشہ متحرک رہتا ہے۔ منفی ہو یا مثبت اس کے خیالات اور نظریات بدلتے رہتے ہیں۔ ان خیالات اور نظریات کا بدلنا ہی مختلف مسالک اور دبستانوں کے وجود میں آنے کا باعث بنتا ہے۔ حالات بدلتے ہیں تو خیالات بھی یکساں نہیں رہتے۔ ادب بھی جامد نہیں رہتا اور تنقید و تنقیدی نظریات بھی بدلتے رہتے ہیں۔ نظریات بدلنے کے باوجود تنقید کا کوئی دبستان یا مسلک جامع نہیں ہوسکتا اور ایک نقاد کو ہر زاویہ ہر نظریہ کو مدِ نظر رکھ کر ادب پارے کا تعین کرنا چاہیے تب جا کر صحیح تنقید ممکن ہے۔ ان ہی خیالات کا اظہار فاطمہ بیگم نے مضمون ’’مولوی عبدالحق کا تنقیدی شعور‘‘ میں کیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

’’افلاطون کے زمانے سے لے کر اب تک تنقید کے بے شمار مسلک وجود میں آچکے ہیں مثلاً جمالیاتی، وجدانی، تاریخی، ماحولی، تاثراتی، نفسیاتی وغیرہ وغیرہ۔ انسانی تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ حالات کبھی بھی یکساں نہیں رہتے۔ حالات کے بدلنے کے ساتھ ساتھ ادب اور تنقید کے نظریے بھی بدلتے ہیں۔ اس لیے تنقید کا کوئی ایک جامع مسلک نہیں ہوسکتا۔ نقاد اپنے رجحان یا ذوق کے زیر اثر ایک طرف جھک جاتے ہیں اور دوسرے رخ پر یا تو سرسری نظر ڈالتے ہیں یا اسے بالکل نظر انداز کردیتے ہیں۔ صحیح تنقید اسی وقت ممکن ہے جب ادب کے ہر رخ کو دیکھا اور جانچا جائے گا۔‘‘

(’’زاویۂ نگاہ‘‘، ڈاکٹر فاطمہ بیگم پروین، مکتبۂ شعر و حکمت، حیدرآباد جنوری 2013، ص 95)

الغرض فاطمہ بیگم پروین کی تنقیدی بصیرت، تنقیدی نظریات میں توضیح اور ادب سے ان کی گہری وابستگی نے انھیں اہل علم خصوصاً حیدرآباد میں ممتاز مقام عطا کیا۔ ان کی تنقیدی کاوشیں اور دکنی ادب کی فہم و تعبیر حیدرآباد میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔

Sabzar Skinder Seh
University Of Hyderabad
Department Of Urdu
Hyderabad- 500046 (T.S)

ادارہ

روداد

علی گڑھ کتاب میلہ 2025

اردو زبان و ادب کے فروغ، ترویج اور اشاعت کے سلسلے میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے گزشتہ چند دہائیوں میں جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں، وہ کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ اردو زبان کو تعلیمی، ادبی اور ثقافتی سطح پر مضبوط بنیاد فراہم کرنے کے لیے قومی اردو کونسل کی کوششیں ہمہ جہت رہی ہیں۔ ملک کے طول و عرض میں اب تک پچیس سے زائد اردو کتاب میلوں کا کامیاب انعقاد اسی سنجیدہ اور مسلسل جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ ان کتاب میلوں نے نہ صرف اردو کتابوں کو قارئین تک پہنچایا بلکہ کتاب کلچر کے فروغ، مطالعے کے ذوق کی بیداری اور نئی نسل کو اردو زبان سے جوڑنے میں بھی نمایاں کردار ادا کیا۔

اسی روشن روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے 22 نومبر سے 30 نومبر تک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں ایک شاندار اردو کتاب میلے کا انعقاد کیا۔ اس

کتاب میلے میں ملک بھر سے تقریباً پچاس معروف پبلشرز اور اشاعتی اداروں نے شرکت کی۔ کتابوں کی خرید و فروخت کے ساتھ ساتھ میلے میں علمی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کا بھی بھرپور اہتمام کیا گیا، جس نے اس کتاب میلے کو محض ایک تجارتی سرگرمی کے بجائے ایک ہمہ جہت ادبی و ثقافتی جشن میں تبدیل کر دیا۔

کتاب میلے کا افتتاحی پروگرام نہایت وقار اور علمی شان و

شوکت کے ساتھ منعقد ہوا۔ افتتاحی اجلاس میں تعارفی کلمات قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے پیش کیے۔ انھوں نے اپنے خطاب میں اردو زبان کے فروغ کے لیے کونسل کی مسلسل کاوشوں پر روشنی ڈالی اور کہا کہ کتاب میلے اردو زبان کو عوام، خصوصاً نئی نسل کے قریب لانے کا مؤثر ذریعہ ہیں۔ افتتاحی اجلاس کا کلیدی خطبہ معروف فکشن نگار جناب سید محمد اشرف نے پیش کیا، جس میں انھوں نے اردو فکشن کے ارتقا، سماجی شعور اور ادبی ذمہ داریوں پر جامع گفتگو کی۔ اس موقع پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلر پروفیسر نعیمہ خاتون مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شریک ہوئیں۔ ان کی موجودگی نے پروگرام کی وقعت میں اضافہ کیا۔ پروفیسر شافع قدوائی نے اظہار خیال کیا جبکہ مہمانِ اعزازی کی حیثیت سے پدم شری پروفیسر سید ظل الرحمن کی شرکت نے افتتاحی اجلاس کو مزید وقار بخشا۔

افتتاحی پروگرام کے بعد ’آئینہ ہے روبرو‘(میرا تخلیقی سفر: مصنفین سے ملاقات) کے عنوان سے ایک اہم ادبی نشست منعقد ہوئی۔ اس پروگرام میں پروفیسر طارق چھتاری، پروفیسر غضنفر اور ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا نے اپنے تخلیقی سفر، ادبی تجربات اور فکری ارتقا پر سیر حاصل گفتگو کی۔ اس نشست کے موڈریٹر ڈاکٹر توصیف بریلوی تھے، جنھوں نے نہایت سلیقے سے گفتگو کو آگے بڑھایا۔ یہ نشست نوجوان قلم کاروں اور طلبہ کے لیے نہایت مفید ثابت ہوئی۔

کتاب میلے کے دوسرے دن تین اہم مذاکروں کا انعقاد کیا گیا، جن کے عنوانات تھے: ’سماجی روایات، رسومات اور محاورات کا زوال: اسباب و امکانات‘، ’اردو زبان کا مستقبل نئی نسل کے حوالے سے‘ اور ’چلو بات کر کے دیکھتے ہیں (شاعروں سے گفتگو)‘۔ ان مذاکروں کی خاص بات خواتین کی بھرپور اور مؤثر شرکت تھی، جس نے اس دن کے پروگراموں کو ایک منفرد شناخت عطا کی۔

’سماجی روایات، رسومات اور محاورات کا زوال‘ کے عنوان سے منعقدہ مذاکرے میں پروفیسر ویبھا شرما (ڈیپارٹمنٹ آف انگلش، اے ایم یو)، ڈاکٹر فوزیہ فریدی (ویمنز کالج، علی گڑھ) اور ڈاکٹر ہما پروین (ڈیپارٹمنٹ آف ماس کمیونیکیشن، علی گڑھ) نے بطور پینلسٹ شرکت کی۔ ان خواتین اسکالرز نے معاشرے میں کمزور ہوتی روایات، زبان میں محاوراتی انحطاط اور سماجی اقدار کے بکھرتے ہوئے ڈھانچے پر نہایت سنجیدہ اور مدلل گفتگو کی۔ اس

مذاکرے میں ڈاکٹر احمد مجتبیٰ صدیقی کی شرکت نے مباحثے کو مزید تقویت بخشی۔ مذاکرے کی موڈریشن زینب فائزہ اسلام نے انجام دی، جنھوں نے سوال و جواب کے مرحلے میں سامعین کو بھی بھرپور انداز میں شریک کیا۔

'اردو زبان کا مستقبل نئی نسل کے حوالے سے' کے عنوان سے ہونے والے مذاکرے میں بھی خواتین کی نمایاں شمولیت دیکھنے میں آئی۔ اس پروگرام میں ڈاکٹر شہناز رحمن اور ڈاکٹر مہر فاطمہ بطور پینلسٹ شریک ہوئیں جبکہ ڈاکٹر فہمینہ علی نے موڈریٹر کے فرائض انجام دیے۔ اس مذاکرے میں اس بات پر زور دیا گیا کہ نئی نسل میں اردو زبان کی مقبولیت بڑھانے کے لیے جدید ذرائع، ڈیجیٹل پلیٹ فارمز اور تعلیمی اصلاحات سے استفادہ ناگزیر ہے۔

علی گڑھ اردو کتاب میلے کے تیسرے دن دو اہم مذاکروں کا انعقاد ہوا۔ پہلا مذاکرہ 'طب یونانی اور اردو زبان و ادب' کے عنوان سے منعقد ہوا، جس میں پروفیسر اشہر قدیر، ڈاکٹر آسیہ سلطانہ اور حکیم فخر عالم بطور پینلسٹ شریک ہوئے۔ اس مذاکرے کی موڈریشن ڈاکٹر شاداب شمیم نے انجام دی۔ خاص طور پر ڈاکٹر آسیہ سلطانہ نے طب یونانی اور اردو زبان و ادب کے باہمی رشتے پر مدلل اور پُراثر گفتگو کی اور خواتین اسکالرز کے علمی اعتماد کا بھرپور اظہار کیا۔

اسی دن دوسرا مذاکرہ 'جدید تکنیکی وسائل اور اردو صحافت: امکانات و چیلنجز' کے عنوان سے منعقد ہوا، جس میں ڈاکٹر راحت ابرار، جناب وجیہ الدین، پروفیسر خالد سیف اللہ اور جناب اشرف بستوی شریک ہوئے۔ اس مذاکرے میں اردو صحافت کو درپیش مسائل، ڈیجیٹل میڈیا کے اثرات اور مستقبل کے امکانات پر کھل کر گفتگو کی گئی۔

کتاب میلے کے چوتھے دن علمی تنوع مزید نمایاں نظر آیا۔ اس دن 'معاصر تحقیق و تنقید: سمت و رفتار'، 'اردو میں سائنسی ادب' اور 'انگریزی شاعری پر مخلوط ثقافت اور زبان کا اثر' کے عنوان سے مذاکرے منعقد ہوئے۔ 'معاصر تحقیق و تنقید' کے مذاکرے میں پروفیسر قمر الہدیٰ فریدی، ڈاکٹر جمیل اختر، پروفیسر محمد علی جوہر اور پروفیسر ضیاء الرحمن شریک ہوئے جبکہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر فیضان الحق نے انجام دیے۔

'اردو میں سائنسی ادب' کے موضوع پر ہونے والے مذاکرے میں ڈاکٹر عبدالمعز شمس، ڈاکٹر فائزہ عباسی اور جناب عادل فراز بطور پینلسٹ شریک ہوئے۔ اس مذاکرے کی نظامت ڈاکٹر حسینہ خانم نے انجام دی۔ خواتین کی اس علمی شرکت نے یہ واضح کر دیا کہ اردو میں سائنسی ادب کی ترویج میں خواتین کا کردار نہایت اہم اور فعال ہے۔

کلچر ایجوکیشن سینٹر کے اشتراک سے منعقدہ 'انگریزی شاعری پر مخلوط ثقافت اور زبان کا اثر' کے مذاکرے میں پروفیسر ثمینہ خاتون (صدر شعبہ انگریزی)، پروفیسر عائشہ منیرہ اور پروفیسر فضا تبسم اعظمی نے بطور پینلسٹ شرکت کی۔ تینوں خواتین اسکالرز نے نہایت پختہ اور مدلل انداز میں انگریزی شاعری پر ثقافتی اختلاط اور لسانی اثرات پر گفتگو کی۔

کتاب میلے کے پانچویں دن چار متنوع پروگرام منعقد ہوئے جن میں 'بچوں کے ادبی رسائل'، 'ڈیجیٹل دنیا میں کتابی ثقافت کا فروغ'، نوجوان شاعروں کا مشاعرہ' اور 'شامِ غزل' شامل تھے۔

بچوں کے ادبی رسائل کے پروگرام میں ڈاکٹر فیضان الحق نے معروف ادیب جناب فیروز بخت احمد سے گفتگو کی، جو ادبِ اطفال کے حوالے سے نہایت معلوماتی اور کارآمد ثابت ہوئی۔

'ڈیجیٹل دنیا میں کتابی ثقافت کا فروغ' کے عنوان سے مذاکرے میں ڈاکٹر عذرا نقوی، ڈاکٹر زبیر شاداب اور ڈاکٹر نوشاد منظر بطور پینلسٹ شریک ہوئے جبکہ ڈاکٹر حنیف خان نے موڈریشن کے فرائض انجام دیے۔ ڈاکٹر عذرا نقوی نے بالخصوص ڈیجیٹل دور میں مطالعے کے رجحان کو فروغ دینے کے عملی پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔

مشاعرے میں ابھرتے ہوئے شعرا نے اپنے کلام سے سامعین کو متاثر کیا جبکہ 'شامِ غزل' کے عنوان سے منعقدہ پروگرام بے حد کامیاب رہا۔ اس میں معراج نشاط، محترمہ یاسمین رضوی، محمد احسان، روہید نور، محراب عباسی اور محترمہ فرحین نے اپنی دلنشیں آواز میں غزلیں پیش کیں۔ اس پروگرام کی نظامت ڈاکٹر دانش محمود نے انجام دی۔

مجموعی طور پر یہ پانچ روزہ اردو کتاب میلہ نہ صرف علمی و ادبی سرگرمیوں کا حسین امتزاج تھا بلکہ اس میں خواتین کی بھرپور، فعال اور مؤثر شرکت نے اس بات کو واضح کر دیا کہ اردو زبان و ادب کے فروغ میں خواتین کا کردار دن بہ دن مضبوط ہوتا جا رہا ہے۔ علی گڑھ اردو کتاب میلہ 2025 اردو زبان، کتابی ثقافت اور فکری مکالمے کے فروغ کی ایک کامیاب اور یادگار مثال کے طور پر ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ **(ادارہ)**

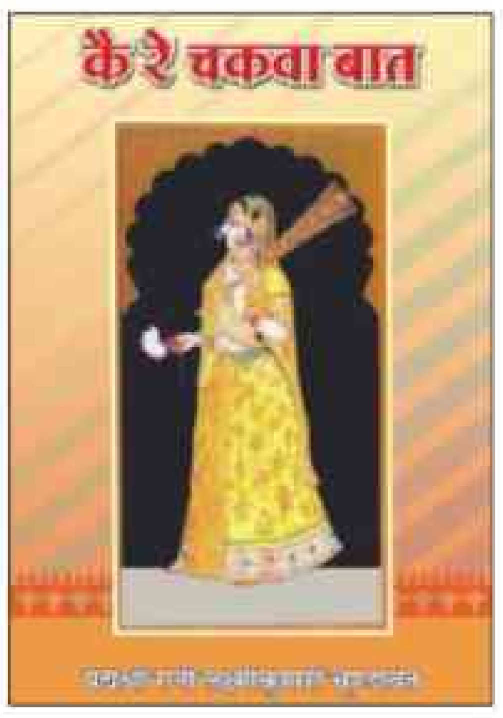

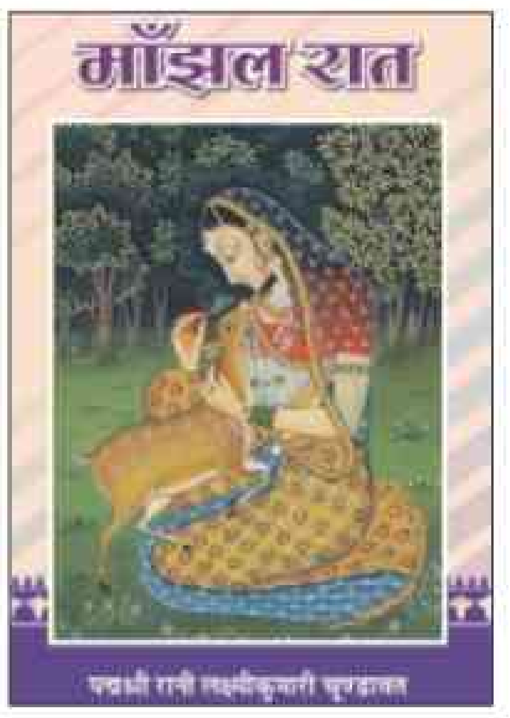

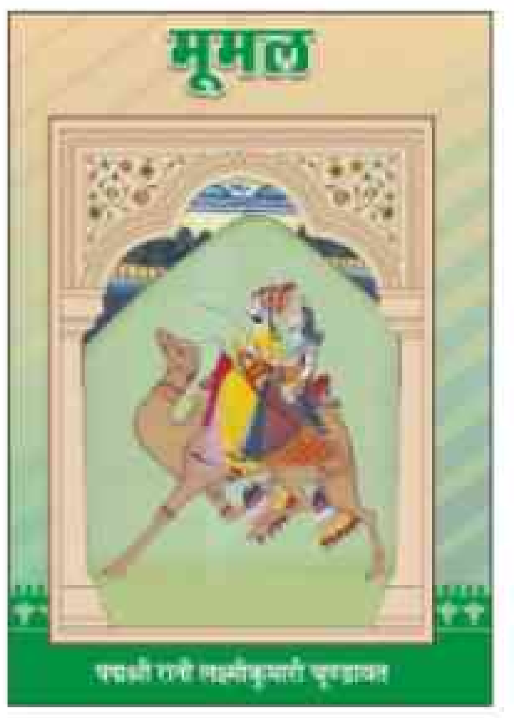

فرخندہ ضمیر

راجستھانی زبان کی ادیبہ

رانی لکشمی کماری چونڈاوت

ادب اطفال سے مراد ایک ایسا ادب جو بچّوں کی جسمانی اور ذہنی صلاحیتوں کو پیش نظر رکھ کر تحریر کیا جائے۔ جس سے بچّوں کی ذہنی نشو ونما بہتر طریقے سے ہو سکے۔ ہم ادبِ عالیہ کو ہی زیادہ اہمیت دیتے آئے ہیں اور ادب اطفال کو نظر انداز کیا ہے۔

ادب اطفال کی اہمیت کو 18 ویں صدی میں مغرب میں تسلیم کیا گیا۔ تھامس بورمین نے ایک کتاب لکھی جس کا نام description of three hundred animals تھا اس میں علم سیکھنے کا ایک فطری عمل ہے۔ اس کتاب میں مختلف جانوروں سے متعلق معلومات کو پیش کیا گیا ہے جس میں بچوں کی دلچسپی قائم رہے۔ وہاں بچّوں کی ذہنی نشوو نما کو دھیان میں رکھتے ہوئے بہت سا ادب لکھا گیا اور لکھا جا رہا ہے harry potter,fairy tale کی کامیابی اس بات کی غماز ہے۔

ہمارے یہاں بھی بچوں کی chronological age کو دھیان میں رکھتے ہوئے کہانیاں، نظمیں لکھی گئیں۔

بچّوں کی ذہن سازی کے لیے ماں، دادی، نانی کی کہانیوں کے ذریعہ یہ فطری علم سکھایا گیا!

ایسی کہانیاں، نظمیں وجود میں آئیں جن سے بچوں کی ذہنی نشو و نما ہو سکے اور وہ ایک بہتر انسان بن سکیں۔

ان کہانیوں میں جنگی مہمات، جس میں شجاعت و بہادری، حق گوئی کی تعلیمات دی گئیں۔

اردو ادب میں ادب اطفال کی اہمیت کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے حالی، اکبرالہ آبادی، اسماعیل میرٹھی، علامہ اقبال، محمد حسین آزاد وغیرہ نے بہت سی نظمیں لکھیں۔

دوسری زبانوں میں بھی ادبِ اطفال کی اہمیت کو تسلیم کیا گیا۔

راجستھانی زبان میں بھی بچوں کے لیے بہت کچھ لکھا گیا۔ جس میں ایک اہم نام رانی لکشمی کماری چونڈاوت کا ہے۔ انھوں نے راجستھانی زبان میں ادبِ عالیہ بھی تحریر کیا اور ادبِ اطفال بھی۔ ان کی ادبی خدمات کو سراہتے ہوئے انھیں پدم شری، ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے نوازا گیا۔

شاہانِ مغلیہ اور راجپوت والیانِ ریاست کے درمیان قرابت داری کا سلسلہ شہنشاہ اکبر سے لے کر فروخ سیئر تک چلا۔ اس قرابت داری اور مراسم نے تہذیب وتمدن، فنونِ لطیفہ، اور زبان و ادب کو بھی متاثر کیا۔

ایسے ہی ماحول میں رانی لکشمی کماری چونڈاوت 24 جون 1916 کو اودے پور کے پاس دیوگڑھ ریاست کے جھالا راجپوت خاندان میں پیدا ہوئیں۔ کم سنی میں تو لڑکوں کی طرح تربیت ہوئی۔ بھائیوں کا اجمیر کے Mayo college میں ایڈمیشن کروایا گیا اور انھیں 7 سال کی عمر میں پردہ کروا کر گھر پر ہی تعلیم کا انتظام کیا گیا۔ پنڈت دیوی چرن سے انگریزی، پنڈت پنّالال جی سے

سنسکرت، اور منشی ظفر علی سے اردو فارسی پڑھی۔

یہ ہندوستان کی ایسی ادیبہ تھیں جنھوں نے اسکول کی صورت نہیں دیکھی لیکن مطالعہ کے شوق نے ان کے علم میں وسعت پیدا کی اور یہ وسیع مطالعہ ان کی تخلیقات میں معاون ثابت ہوا۔

اپنی محرومی کو انھوں نے اپنی تین بیٹیوں کی تعلیم کے ذریعہ پورا کیا۔ بیٹوں کو اجمیر کے میو کالج میں داخلہ دلوایا تو بیٹیوں کو صوفیہ کالج میں تعلیم دلوائی۔

اس روشن خیال ادیبہ نے 14 سال کی عمر سے ہی بچوں کی میگزین 'بال سکھا' کے لیے لکھنا شروع کیا۔ اپنے بچّوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اپنے ادبی ذوق کی بھی تسکین کرتی رہیں۔ ادبِ عالیہ اور ادبِ اطفال پر ان کا قلم چلتا رہا۔

انھوں نے راجستھانی زبان جسے مایڑ بھاشا بھی کہا جاتا ہے۔ اس میں کہانیاں ڈرامہ، گیت دوہے، سفر نامے وغیرہ لکھے۔ انھوں نے اپنی تخلیقات میں راجپوت سماج کے تہذیب وتمدن پر روشنی ڈالی ہے کیونکہ وہ خود اس ماحول کی پروردہ تھیں۔ انھوں نے راجپوتانہ کے تاریخی اور نیم تاریخی قصوں کو ہی اپنی کہانیوں اور ڈراموں کا موضوع بنایا۔ ان میں ماضی کی المناک داستانیں بھی ہیں تو فرسودہ رسم ورواج کے نام پر عورتوں کا استحصال۔ وہ فسطائی طاقتوں کے نظریہ سے اختلاف رکھتی تھیں۔ اشتراکی نظریہ کی حامل تھیں۔ ان کی تخلیقات بھی اسی نظریہ کی نشاندہی کرتی ہے۔ اسی لیے ان کے یہاں حاکموں کے ظلم وستم کی داستانیں ہیں تو اخوت ومساوات، محبت و بھائی چارا بھی نمایاں ہے۔

ان کی ادبی تصانیف میں مانجھل رات، مومل، ویروان، سولی راسویا ماتھے وغیرہ ان کے افسانوی مجموعے ہیں۔ 'راجستھان کی پریم کتھائیں'، 'گج بن'، 'شانتی کے لیے سنگھرش'، 'لینن ری جیونی اور ایک سفر نامہ'، 'ہندوکش کے اس پار' وغیرہ ان کی یہ تصانیف ادبِ عالیہ کے لیے ہیں۔

انھوں نے بچّوں کی ذہنی نفسیات کو دھیان میں رکھتے ہوئے کئی کہانیاں لکھیں۔ 14 سال کی عمر سے بچّوں کی میگزین ''بال سکھا'' کے لیے لکھنے لگیں۔ ان کی کہانیوں کے کئی مجموعہ منظر عام پر آچکے ہیں جن میں 'ہنکارا دوسا، ٹابرا ں ری باتاں، امولک باتاں اور رجواڑی لوک گیت، کیرے چکبا بات' وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

رانی لکشمی کماری چونڈاوت نے چرند پرند کے ذریعہ بچّوں کو لطیف پیرائے میں انسانیت اور حق گوئی کا سبق سکھایا ہے۔

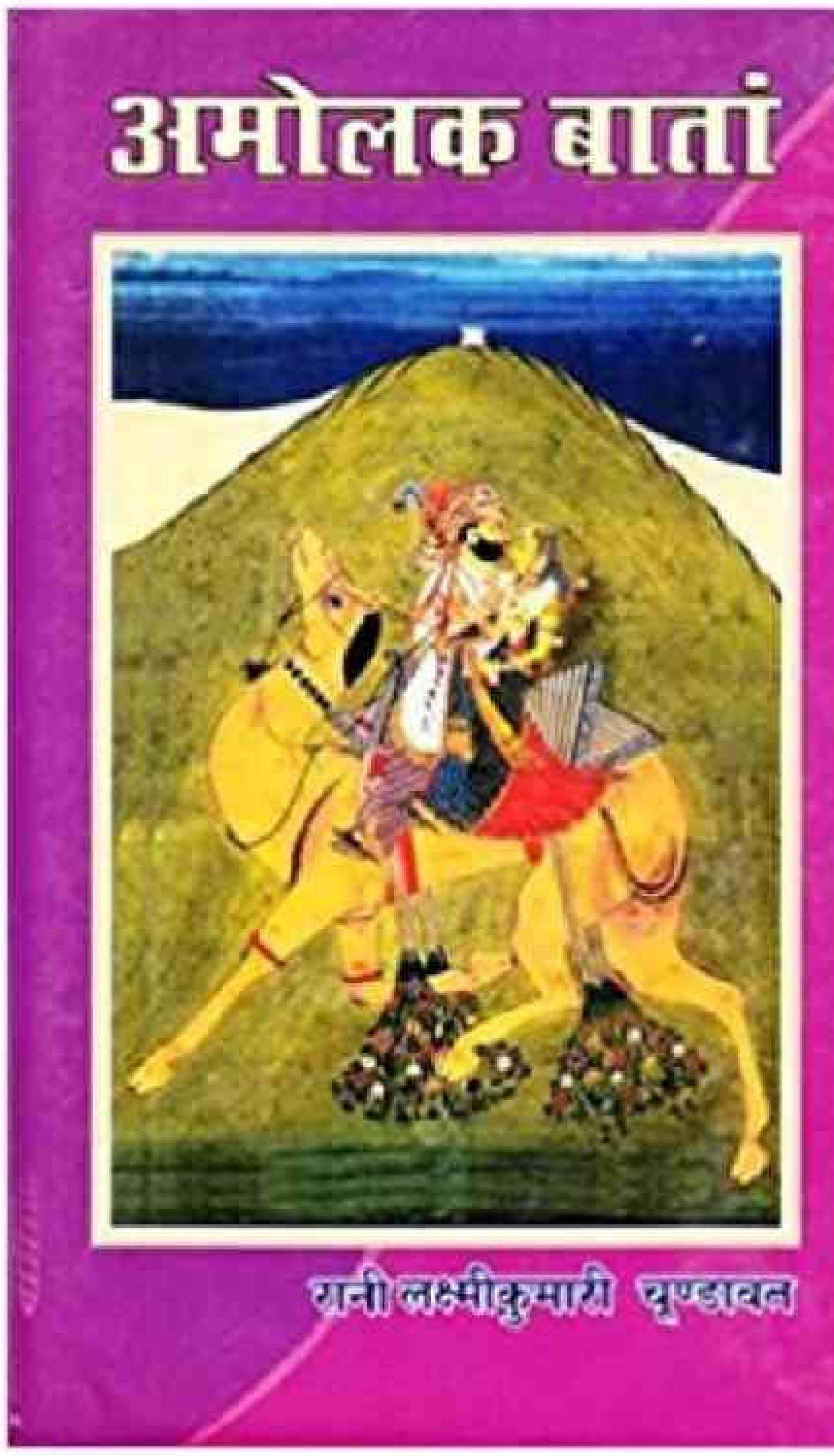

'امولک باتاں' میں چار کہانیاں ہیں۔ ان چاروں کہانیوں میں بچّوں کو شجاعت و بہادری کا سبق سکھایا گیا ہے۔

کہانیوں کا مجموعہ 'ہنکارا دوسا' میں بچپن میں نانی دادی سے سنی کہانیوں کے ذریعہ اخلاقی درس دیا ہے۔ نانی دادی ہمارے ہندوستانی سماج کی وہ اہم ستون ہواتی ہیں جن کے ذمّہ نسلوں کی پرورش ہوتی تھی۔ وہ اپنی زندگی کے تجربے سے بچّوں کی سائیکی، ان کی ذہنی نفسیات کو دھیان میں رکھتے ہوئے ذہن سازی کرتی تھیں۔ ان کو نیک اور ذمّہ دار انسان بنانے کے لیے ان کو کہانیوں کے ذریعہ اخلاقی درس دیتی تھیں۔ لیکن افسوس اب وہ زمانے چلے گئے۔ سب کو ٹی۔ وی اور موبائل نے بدل دیا ہے۔

رانی خود ایک ماں تھیں اس لیے وہ بچّوں کی نفسیات سے بخوبی

واقف ہیں۔جس طرح دنیا کی ہر زبان میں مافوق الفطرت عناصر کے ذریعہ بچوں کو کہانیاں سنائی جاتی ہیں ۔ اسی طرح راجستھانی زبان میں بھی یہی مافوق الفطرت عناصر موجود ہیں۔

ہیری پاٹر کی کہانیوں کی مقبولیت اس کی بہترین مثال ہے۔ سینہ بہ سینہ چلی آ رہی چڑے چڑیا کی کہانی، پیاسا کوّا، سارس اور لومڑی، شیر کی کہانی وغیرہ آج بھی ہر بچہ کو سنائی جاتی ہیں۔ اپنی کہانیوں میں چرند پرند، بھوت پریت، پری، جن بھوت کے ذریعہ بچّوں کے دل ودماغ تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔

بچّوں کی نفسیات، ان کی معصومیت، ان کا بھول پن ،ان کی شرارتیں صفحہ قرطاس پر چابکدستی سے پیش کرنے کا ہنر انھیں خوب آتا ہے۔

اس مجموعے میں اوندراری بات یعنی چوہوں کی بات، منی بائی گنگا جی چالیا، ٹپوکڑا، ڈوکری ری بات، سیٹھانی ری بات، بہوری بات وغیرہ دلچسپ کہانیاں ہیں ۔ ٹپوکڑا کہانی بھی بچّوں کے لحاظ سے لکھی گئی دلچسپ کہانی ہے۔

راجستھانی زبان میں بارش کی بوندوں کی ٹپ۔ٹپ کو ٹپوکڑا کہتے ہیں۔اس ٹپ ٹپ کو نرالے انداز میں بیان کیا ہے۔

ایک گاؤں میں ایک بڑھیا اوراس کا پوتا رہتے تھے۔ بارش شروع ہوگئی۔ بڑھیا کی جھونپڑی کی چھت سے بوندوں کی ٹپ ۔ ٹپ شروع ہوگئی! بڑھیا پریشان ہوگئی۔

اتنے میں ایک شیر برسات سے بچنے کے لیے گائے بھینس کے خالی پڑے طبیلے میں آ کر بیٹھ گیا ۔ اندر سے آوازیں آنے لگیں۔ بچہ دادی سے کہتا ہے۔

”دادی آپ کو کسی سے ڈر نہیں لگتا ہے؟“

ہاں مجھے کسی سے ڈر نہیں لگتا“ دادی نے کہا۔

”شیر سے بھی نہیں“!

”نہیں شیر سے بھی نہیں ڈرتی میں“ دادی نے پوتے کو پلنگ پر بٹھاتے ہوئے کہا۔تو کس سے ڈرتی ہو آپ؟“ ”ٹپوکڑے سے“۔

شیر یہ ساری باتیں سن رہا تھا۔شیر ڈر گیا اور سوچنے لگا۔! شاید یہ ٹپوکڑا مجھ سے بھی زیادہ طاقتور ہے۔عافیت اسی میں ہے کہ یہاں سے بھاگ چلو،شیر ڈر کر وہاں سے نکل گیا۔ رات کے اندھیرے میں ایک آدمی اپنے گدھے کو ڈھونڈتا ہوا آ رہا تھا۔شیر نے سوچا یہ ہی ٹپوکڑا ہے وہ بھاگنے لگا۔اندھیرے میں وہ آدمی اسے اپنا گدھا سمجھا اس کو بھاگ کر پکڑ لیا اسے دو تین ڈنڈے مارے اور اس کی پیٹھ پر بیٹھ گیا۔شیر ڈر کے مارے دم دبا کر چلتا رہا۔صبح کا اجالا پھیلا۔لوگوں نے دیکھا تیس مار خاں شیر پر بیٹھا ہے ۔ اس کی بہادری کی دھاک جم گئی۔

تیس مار خاں نے جھونپڑی کے باہر کھونٹے سے اسے باندھا اور اندر چلا گیا۔شیر نے اپنی پوری قوت لگا کر کھونٹے کو اکھاڑا اور وہاں سے جان بچا کر بھاگا۔

ایسی ہی اور کہانیاں بچّوں کی نفسیات اور ذہنی سطح کو دھیان میں رکھ کر لکھی گئی ہیں۔

دوسرا افسانوی مجموعہ ’ٹابراں ری باتاں‘

اس مجموعے میں زیادہ تر ’پنچ تنتر‘ کی کہانیوں کو نئے پیرائے بیان میں پیش کیا گیا ہے ۔ چڑا چڑی کھچڑی، کاگ موتی دے نی چنزی روتی رے نی، چھوٹے منڈے موٹی بات، رانی جی وغیرہ کہانیوں میں مافوق الفطرت عناصر کے ذریعہ بچّوں کو رشتوں کی عظمت کا احساس کرایا ہے۔انسانیت کا سبق سکھایا۔زندگی کے سرد وگرم سے آشنا کرانے کی کوشش کی ہے۔ جیسے چڑا چڑی کی کہانی بہت مشہور ہے۔ہم نے بھی اپنی گھر کی خواتین سے یہ کہانی سنی اور شاید ہر دور میں سنائی گئی ہو۔ یہ کہانیاں ہر مذہب وملّت سے پرے ہر قوم کا سرمایہ ہوتی ہیں جو سینہ بہ سینہ چلتی رہتی ہیں۔

رانی لکشمی کماری چونڈاوت ایک ماں تھیں اور انھیں احساس تھا کہ بچّوں کی تربیت کے لیے اخلاقی تعلیم کتنی ضروری ہے۔اس لیے انھوں نے بچّوں کے لیے ایسا ادب تخلیق کیا جو لطیف پیرائے میں اخلاقیات وانسانیت کی تعلیم دے سکے۔ کئی جگہ وہ ہنسی مذاق اور کھیل کھیل میں بہت کچھ بیان کر دیتی ہیں تاکہ بچّوں کی طبیعت پر گراں نہ گزرے۔

رانی جی کا بیانیہ بڑا ہی دلکش ہے۔ان کے مکالمہ بڑے ہی دلچسپ ہوتے ہیں۔ اپنے بیانیہ کو پر اثر بنانے کے لیے وہ گیت، دوہے برمحل استعمال کرتی ہیں۔ انھوں نے ادب اطفال اور ادب عالیہ کے لیے بے شمار کہانیاں لکھی ہیں۔ان کہانیوں میں راجستھان کی تہذیب وتمدن کا عکس ہمیں نمایاں نظر آتا ہے۔

ان کی کہانیوں کے موضوع تعلیم کی اہمیت، دانش مندی، ایمانداری، تہذیب، سچّائی، حق گوئی ہیں۔انھوں نے بچّوں کی ذہن سازی کے لیے ان سے تعلق رکھنے والے ہر موضوع کو اپنی کہانیوں میں پیش کیا ہے۔ان کہانیوں کے ذریعہ وہ بچّوں کو سبق دیتی ہیں کہ تعلیم یافتہ بچّے کس طرح عقل اور دانش کا استعمال کر کے مشکل سے مشکل حالات کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔

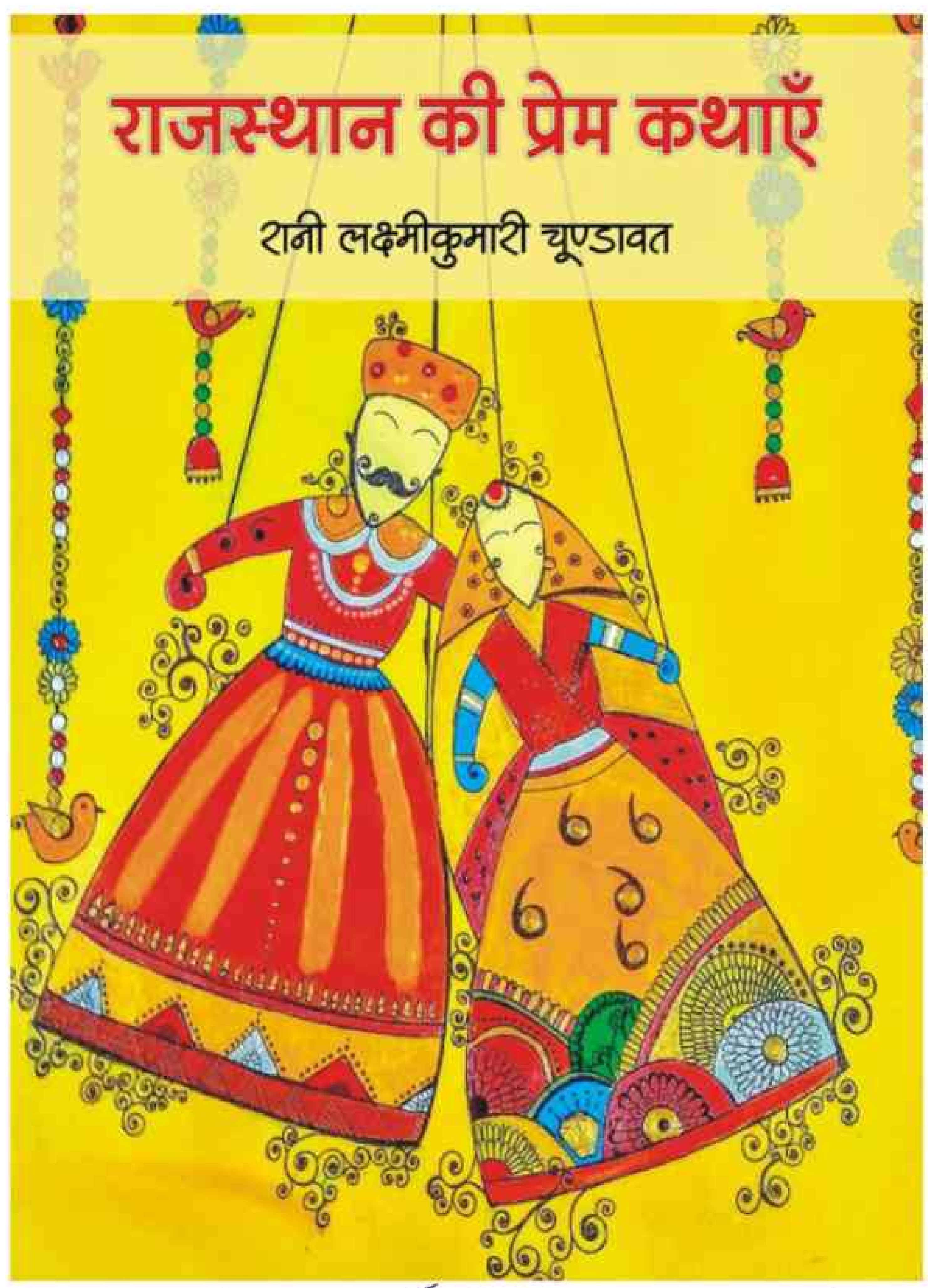

کردار نگاری میں وہ کمال ملکہ رکھتی ہیں۔ان کی کہانیوں کے کردار راجہ، مہاراجہ، نوکر چاکر، چرند پرند سب ہی ہیں۔اس بات کا خاص خیال رکھتی ہیں کہ کس کردار کو کس طرح پیش کرنا ہے۔ مکالمہ نگاری میں بھی ان کو بڑا سلیقہ آتا ہے۔ان کو معلوم ہے کہ بچّوں سے کس طرح کے مکالمے ادا کروانے ہیں، بڑوں سے کیسے۔

راجستھانی زبان ایک میٹھی زبان ہے۔ اس میں تہذیب بھی ہے۔عزت دینے کے لیے 'سا' لفظ کا استعمال ہوتا ہے۔ آؤ سا، کھاؤ سا، بیٹھو سا، یہ اردو زبان اور مغل راجپوت مراسم کا اثر ہے۔ رانی اردو فارسی سے بھی واقف تھیں اس لیے بہت سی جگہ اردو کے لفظ بھی استعمال کرتی ہیں۔ جیسے عقل ری پوشاک، عقل بدر، انارا بیگم وغیرہ۔

رانی نے اپنے تخلیقی سفر میں عورتوں اور بچوں کے لیے بہت لکھا۔ انھوں نے بچّوں اور خواتین کی نفسیات کو پیش کرنے میں اپنے قلم کے جوہر دکھائے ہیں۔انھوں نے تعلیم نسواں پر بہت زور دیا، کئی اسکول کھلوائے کیونکہ وہ اس بات سے واقف تھیں کہ ایک بچّے کی پہلی درس گاہ ماں کی گود ہوتی ہے۔انھوں نے اپنی تصانیف کے ذریعہ راجستھانی کلچر کو پیش کیا ہے۔ انگریزی میں بھی انھوں نے 'کلچر ہیری ٹیج آف راجستھان' لکھی۔

انھوں نے سیاست میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیا۔1962 سے 1985 تک سیاست میں رہیں۔1972 سے 1974 تک ان کی ادبی خدمات کے مدّ نظر انھیں راجیہ سبھا کا ممبر بنایا گیا۔

ان کی قلم کی روانی نے عوام کے دلوں میں انھیں جو عزّت و مرتبہ دلایا اسے راجستھان کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ ان کی ادبی خدمات پر انھیں بہت سے اعزازات سے نوازا گیا۔ 1974 میں انھیں ملک کا نامور ایوارڈ 'پدم شری' دیا گیا۔سوویت لینڈ نہرو اوارڈ، راجستھان رتن، راجستھان ساہتیہ اکادمی اوارڈ، مہارانا کمبھا اوارڈ وغیرہ نے ان کی شخصیت میں چار چاند لگا دئے۔

24 مئی 2014 کو اس ادیبہ کا زندگی کا سفر ختم ہوگیا۔لیکن ان کی ادبی خدمات کی وجہ سے وہ ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔

❑❑❑

Prof. Farkhanda Zameer
H No 953/32
Khanpura
Ajmer-305003 (Rajasthan)
farkhandalodi@gmail.com

سمرین بانو

اردو خاکہ نگاری میں خواتین کا حصہ

ادب ایک ایسا فن ہے جو انسانی زندگی کے جذبات، خیالات اور تجربات کو خوبصورت اور موثر انداز میں پیش کرتا ہے۔بعض اصناف فنی اعتبار سے بظاہر تو بہت سادہ نظر آتی ہیں لیکن حقیقت میں بہت پیچیدہ ہوتی ہیں۔ خاکہ بھی ایسی ہی صنف ادب ہے۔ خاکے کا فن بہت دلچسپ اور مشکل فن ہوتا ہے۔اسے اگر ہم نثر میں غزل کا فن کہیں تو بے جا نہ ہوگا کیونکہ جس طرح غزل میں ایجاز کے ساتھ طویل مطالب بیان کرنے ہوتے ہیں ٹھیک اسی طرح خاکے میں بھی مختصر الفاظ میں پوری شخصیت کو پیش کرنا پڑتا ہے۔'ڈاکٹر صابرہ سعید' خاکے کے متعلق فرماتی ہیں:

''اس کو اشاروں کا آرٹ کہا جاتا ہے، اس میں اتنی وسعت ہوتی ہے کہ ایک پھول کے مضمون میں تمام گلشن کی روح بند کی جاسکتی ہے۔ خاکہ میں زندگی کے ہر پہلو کو سمو لینے کی بڑی صلاحیت ہوتی ہے۔''

(اردو ادب میں خاکہ نگاری: ڈاکٹر صابرہ سعید، مکتبہ شعر وحکمت، 1978، ص:9)

اردو کی غیر افسانوی نثری اصناف میں خاکہ نگاری کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ دیگر نثری اصناف کی طرح اس نے بھی بہت کم عرصے میں اپنی جڑوں کو مضبوط کیا اور دلکشی کے مختلف نمونے پیش کیے ہیں۔

خاکہ کے لغوی معنی ڈھانچہ بنانے ،لکیر کھینچ کر نقشہ بنانے یا تصویر بنانے کے ہیں۔ انگریزی میں اسے 'اسکیچ' کہتے ہیں۔

اصطلاح میں خاکہ اس مضمون کو کہتے ہیں جس میں کسی شخصیت کے اہم اور منفرد پہلوؤں کو بغیر کسی مبالغے کے اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ اس کی ایک تصویر سامنے آجائے۔ اس میں خاکہ نگار اس شخص کے کسی بھی پہلو کو موضوع بنا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر اس میں کسی شخصیت کے ناک نقشہ، عادات واطوار، رہن سہن، کردار، لباس یا گفتگو کے انداز کو مختصر طور پر اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ اس کی خوبیاں اور خامیاں اجاگر ہو جاتی ہیں اور ایک جیتی جاگتی تصویر قاری کے ذہن میں گردش کرنے لگتی ہے۔یعنی خاکہ نگاری شخصیت کا عکس پیش کرتی ہے۔ اختصار اس کی بنیادی شرط ہے کیونکہ اس میں غزل یا افسانہ کی طرح اشارے کنائے سے کام لیا جاتا ہے۔اس میں مبالغے کی گنجائش نہیں ہوتی ہے۔مولوی عبدالحق نے 'نام دیو مالی' اور رشید احمد صدیقی نے 'کندن' پر خاکہ لکھ کر یہ واضح کر دیا کہ خاکے کا موضوع صرف عظیم شخصیتیں نہیں بلکہ عام انسان بھی ہو سکتے ہیں۔خاکہ نگار کی تعریف بیان کرتے ہوئے" پروفیسر شمیم حنفی" رقم طراز ہیں:

''خاکہ نگار ایک چابک دست مصور ہوتا ہے جو گنتی کی چند لکیروں یا ہوش کے چند اسٹروکس کے وسیلے سے ایک جامع اور ہمہ گیر اور متحرک تصویر لفظوں میں اتار دیتا ہے۔ کسی شخصیت کے ایسے عناصر جو مرکزی حوالوں کی حیثیت رکھتے ہوں یا اس سے وابستہ ایسے واقعات جن سے شخصیت کے بھید کھلتے ہوں خاکہ نگار کا بنیادی سروکار انھیں سے ہوتا ہے۔''

(پروفیسر شمیم حنفی: آزادی کے بعد دہلی میں اردو خاکہ، اردو اکیڈمی دہلی، 1991 ص:11)

ناول اور افسانہ کی طرح خاکہ بھی مغربی ادب کی دین ہے۔

اردو ادب میں خاکہ نگاری کی ابتدا کب اور کیسے ہوئی اس کا قطعی طور پر تعین ممکن نہیں۔شاعری، جو نثری ادب کی بنسبت زیادہ قدیم ہے، اس صنف کے ابتدائی نقوش بکثرت ملتے ہیں۔خصوصیت سے مرثیہ قصیدہ اور مثنوی میں اس کی جھلکیاں نظر آتی ہیں اور نثری ادب میں اس صنف کے ابتدائی نمونے تذکروں میں ملتے ہیں۔ان میں جا بجا ایسے بیانات ملتے ہیں جن سے شاعروں کے کلام کے علاوہ ان کی شخصیت کا دھندلا اور ادھورا عکس بھی سامنے آتا ہے۔'نکات الشعرا' اور بعض تذکروں میں ملنے والے نقوش اتنے مکمل نہیں ہیں کہ ہم انھیں خاکہ کہہ سکیں لیکن 'آب حیات' خاکہ نگاری کے اعتبار سے ایک اہم دستاویز ہے۔آزاد کو چند لفظوں میں پورا سرمایہ بیان کرنے کا غیر معمولی سلیقہ حاصل تھا۔شکل، صورت، لباس، حلیے، عادات و خصائل کا بیان آزاد کم سے کم لفظوں میں اس طرح کرتے ہیں کہ بیان کی جانے والی شخصیت جاگ اٹھتی ہے۔محمد حسین آزاد اس سلسلے میں آب حیات کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ:

''اور جہاں تک ممکن ہو اس طرح لکھوں کہ ان کی زندگی کی بولتی، چلتی، پھرتی تصویریں سامنے آن کھڑی ہوں اور انہیں حیات جاویداں حاصل ہو۔''

(محمد حسین آزاد: آب حیات، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، 2003، ص:4)

اردو ادب میں خاکہ نگاری کی باقاعدہ ابتدا 'مرزا فرحت اللہ بیگ' نے 1927 میں 'نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ میری زبانی' لکھ کر کی جو اردو ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔مرزا نے اپنے استاد کی پوری تصویر الفاظ کے ذریعے آنکھوں کے سامنے اتار دی۔اس میں انسان کو اس کی کمزوریوں اور اوصاف سمیت قبول کرنے کا میلان نمایاں ہے۔ ''دہلی کا یادگار مشاعرہ'' ان کا دوسرا اہم خاکہ ہے۔

اس کے بعد خاکہ نگاری کے فن کو عروج پر پہنچانے والوں میں 'مولوی عبدالحق' کا 'چند ہم عصر'، 'رشید احمد صدیقی' کی تین کتابیں 'گنج ہائے گراں مایہ'، 'ہم نفسان رفتہ'، 'ذاکر صاحب'، 'عصمت چغتائی' کا 'دوزخی'، 'سعادت حسن منٹو' کا 'گنجے فرشتے'، 'لاؤڈ اسپیکر' اور 'فلمی شخصیتیں'، مالک رام کا 'وہ صورتیں الٰہی'، 'صالحہ عابد حسین' کا 'جانے والوں کی یاد آتی ہے'، 'پروفیسر سلیمان اختر جاوید' کا 'چہرہ چہرہ داستان' وغیرہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ان کے علاوہ خواجہ حسن نظامی، اشرف صبوحی، شوکت تھانوی، سید اعجاز حسین، علی جواد زیدی، قرۃ العین حیدر، صغرا مہدی اور بلونت سنگھ وغیرہ نے بھی چند ایسے خاکے لکھے جو متاثر کرتے ہیں۔

بعض غیر معروف ادیبوں نے بعض ایسے خاکے تحریر کیے ہیں جو معروف خاکہ نگاروں کی بہت سی لفظی تصویروں سے زیادہ جاندار اور متحرک ہیں۔مثال کے طور پر ڈاکٹر خلیق انجم، خواجہ احمد فاروقی، عبادت بریلوی، قدرت اللہ شہاب وغیرہ کے بعض خاکے۔

اردو خاکہ نگاری کے ارتقا میں خواتین نے بھی مردوں کے شانہ بہ شانہ حصہ لیا جو ان کے علمی شغف و شعور اور سماجی بصیرت کی پختگی کا ثبوت ہے۔ان کا مقصد محض اپنی نمائندگی نہیں تھا بلکہ ان میں عصری تقاضوں کے تحت سماج کو سجانے، سوارنے اور نابرابری کے خاتمے کا جذبہ بھی کارفرما تھا۔

خواتین خاکہ نگاروں نے بیسویں صدی سے لکھنا شروع کر دیا تھا اور ان کی تحریریں منظر عام پر آنے لگی تھیں۔تب سے آج تک یہ عمل مسلسل جاری ہے غیر افسانوی نثر کے فروغ میں ان کا کردار نہایت اہم رہا ہے۔1960 تک آتے آتے متعدد خواتین خاکہ نگار سامنے آئیں۔ یہ وہ دور تھا جب جدیدیت کا رجحان دم توڑ رہا تھا اور مابعد جدیدیت کی شروعات ہو رہی تھی کئی خاتون نان فکشن نگار آج بین الاقوامی شہرت کی مالک ہیں جو فن اور موضوع دونوں اعتبار سے وسعت بخش رہی ہیں۔

اردو میں جدید خواتین خاکہ نگاروں کی ایک بڑی تعداد موجود ہے۔جنھوں نے اپنی تحریروں سے اردو خاکہ اور غیر افسانوی ادب میں گراں قدر اضافہ کیا اور سماج پر اپنے افکار و خیالات کا گہرا اثر ڈالا۔ان خواتین میں قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، صغرا مہدی، جیلانی بانو، صالحہ عابد حسین، پروفیسر شمیم نکہت وغیرہ ہیں۔ان

خاتون خاکہ نگاروں نے خاکہ کو ایک نئی سمت و رفتار اور وقار و بلندی سے روشناس کرانے کا فریضہ انجام دیا۔

جن میں چند خاتون خاکہ نگاروں کی حیات اور کارنامے کا مختصر تعارف پیش خدمت ہے:

عصمت چغتائی:

یہ اردو ادب کی صف اول کی فنکار ہیں۔عصمت بدایوں میں 1915 کو پیدا ہوئیں اور ان کا انتقال ممبئی میں 24 اکتوبر 1991 کو ہوا۔ یہ اپنے والدین کی دسویں اولاد تھیں۔انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ڈرامہ نگاری سے کیا تھا۔ان کا پہلا ڈرامہ 'فسادی' تھا جو 1938 میں رسالہ 'ساقی' سے شائع ہوا۔ان کا پہلا ناول ضدی جو 1941 میں شائع ہوا اور ان کا پہلا افسانوی مجموعہ 'کلیاں' اور پہلا مطبوعہ افسانہ 'کافر' ہے۔

انھوں نے اپنے بڑے بھائی" عظیم بیگ چغتائی" کا خاکہ 'دوزخی' کے نام سے لکھا جو اردو ادب کا بے حد مشہور و مقبول خاکہ ہے۔عصمت نے اپنے بھائی کی زندگی کے ہر پہلو کی تصویر بڑی بے باکی سے کھینچی ہے۔ اس میں بھائی سے محبت کا اظہار بھی ہے اور نفرت بھی، ہمدردی بھی ہے اور بے رخی بھی۔منٹو نے اس خاکے کی تعریف میں اپنی بہن سے کہا ہے کہ:

''اقبال اگر میری موت پر تم ایسا ہی مضمون لکھنے کا وعدہ کرو تو خدا کی قسم میں آج ہی مرنے کے لیے تیار ہوں۔''

(سعادت حسن منٹو: گنجے فرشتے، ساقی بک ڈپو، دہلی 1993، صفحہ نمبر:140)

اس کے علاوہ عصمت نے 'میرا دوست، میرا دشمن' کے عنوان سے منٹو کا خاکہ، 'خوابوں کا شہزادہ' کے عنوان سے سجاد ظہیر کا خاکہ، 'سوکھے پتے' کے عنوان سے میرا جی کا خاکہ اور 'نئے ادب کے معمار' کے عنوان سے مجاز کا خاکہ لکھا ہے۔ یہ بھی ان کے بہترین خاکوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔اس کے بعد انھوں نے پطرس، خواجہ احمد عباس، کرشن چندر وغیرہ پر بھی خاکے لکھے ہیں۔

صالحہ عابد حسین:

خاکہ نگاری کی روایت میں خواتین قلم کاروں میں عصمت کے بعد اہم نام صالحہ عابد حسین کا ہے۔انھوں نے ناول اور افسانہ کے علاوہ خاکہ نگاری میں بھی اپنے کمالات دکھائے ہیں۔

صالحہ عابد حسین 1913 کو پانی پت پنجاب میں پیدا ہوئیں اور ان کا انتقال 1988 کو دہلی میں ہوا۔" جانے والوں کی یاد آتی ہے "اور" بزم دانشوراں" ان کے خاکوں کے دو مجموعے ہیں۔ ان کی زبان سادہ، سلیس اور انداز بیان نہایت دلکش ہے۔انھوں نے اپنے عہد کی معروف شخصیات کے خاکے لکھے جن میں خواجہ الطاف حسین حالی، مہاتما گاندھی، مولانا ابوالکلام آزاد، جواہر لال نہرو، ڈاکٹر ذاکر حسین وغیرہ شامل ہیں۔انھوں نے خواجہ الطاف حسین حالی کا خاکہ 'ایک بڑا انسان' کے عنوان سے لکھا ہے جس میں انھوں نے مولانا حالی کی سیرت اور کردار پر بخوبی روشنی ڈالی ہے۔اس کی ایک مثال پیش خدمت ہے:

''کہیں سیلاب آ جاتا تو وہ ساری ساری رات ٹہلتے رہتے، کہیں قحط پڑ جاتا تو ان کو کھانا پینا دشوار ہو جاتا۔فیاضی کا یہ عالم تھا کہ بقول ان کے ملازم" اس طرح مٹھی بند کر کے دیتے کہ پتہ نہ چلتا کیا دیا ہے"۔ پھر مدد صرف مالی نہ ہوتی تھی بلکہ جس کو جس قسم کی مدد کی ضرورت ہو، دوا علاج کرانا ہو، کسی بیکار کو نوکری دلوانا ہو، کسی مایوس کو ڈھارس بندھانا ہو حالی اسے اپنا فرض سمجھتے تھے''

(صالحہ عابد حسین: جانے والوں کی یاد آتی ہے، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، 1974، صفحہ نمبر:19)

رضیہ سجاد ظہیر:

ان کا نام خواتین خاکہ نگاروں میں نہایت اہم ہے۔ وہ 1917 کو اجمیر، راجستھان میں پیدا ہوئیں۔ ان کا نام شادی سے قبل 'رضیہ دلشاد' تھا لیکن سجاد ظہیر سے شادی کے بعد رضیہ سجاد ظہیر بن گئیں۔

یہ بھی ترقی پسند ادیبوں کی صف اول میں شمار کی جاتی ہیں۔ وہ اشتراکی خیالات کی ہمنوا تھیں 'تہذیب نسواں' اور 'عصمت' وغیرہ رسالوں میں ان کی تحریریں شائع ہوتی تھیں۔ان کے دو مجموعے 'زرد گلاب' اور 'اللہ دے بندہ لے' کے عنوان سے شائع ہوئے ہیں

جن میں افسانے اور خاکے دونوں شامل ہیں۔

قرۃ العین حیدر:

اردو ادب کی اس مشہور و مقبول فنکار کی پیدائش 1927 میں علی گڑھ میں اور وفات 2007 میں نوئیڈا میں ہوئی۔ ان کا فرضی نام 'نیلوفر' اور عرفیت 'عینی آپا' تھی۔

انھوں نے اردو فکشن میں عظیم خدمات انجام دی ہیں۔ ان کے خاکوں میں ان کی عالمانہ و دانشورانہ صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ ملتا ہے۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں انگریزی ادب سے استفادہ کیا ہے۔ انھوں نے جو خاکے لکھے وہ ان کے مجموعے " پکچر گیلری " میں شامل ہیں۔ اس مجموعے میں ان کے کل چھے خاکے ہیں۔ اس میں سجاد حیدر یلدرم کا خاکہ " چاندنگر کا جوگی " کے عنوان سے ابن انشاء کا خاکہ اور ساتھ ہی ساتھ مولانا مہر محمد خان، شاہد احمد دہلوی وغیرہ پر لکھے ہوئے خاکے بھی شامل ہیں جو خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

بیگم انیس قدوائی:

ان کی پیدائش بارہ بنکی کے مشہور قدوائی خاندان میں اور انتقال 1982 کو ہوا۔ انھوں نے کانگریس میں شامل ہو کر مجاہد آزادی کی حیثیت سے کارہائے نمایاں انجام دیے۔

سیاست کی مصروفیت کے باوجود بیگم انیس قدوائی اردو ادب کی خدمت سے غافل نہیں رہیں۔ انھیں اردو ادب سے فطری دلچسپی تھی۔ انھوں نے کئی مضامین اور کتابیں لکھیں۔ ان کے خاکوں کا مجموعہ 'اب جن کے دیکھنے کو' کے عنوان سے شائع ہوا۔ انھوں نے قدسیہ زیدی کا بھی خاکہ لکھا جو ادب کے لحاظ سے نہایت اہم ہیں۔

ان کے بعد خاکہ نگاری کے فن اور روایت کو آگے بڑھانے والوں میں 'عفت آرا' کا نام بھی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب " نشیب وفراز " میں 13 خوبصورت اور دلکش خاکے تحریر کیے ہیں۔ انھوں نے حضرت بی بی فاطمہ، پروفیسر اسلوب احمد انصاری، ڈاکٹر سید امین اشرف، جہاں آرا وغیرہ کا انتخاب کیا۔ یہ سب شخصیات ادبی، روحانی اور فکری اعتبار سے مقبول اور معتبر ہیں۔ خواتین خاکہ نگاروں میں عفت آرا کا تذکرہ خاص طور پر کیا جاتا ہے۔ اس صنف میں ان کا ادبی کارنامہ خواتین کی اہمیت کو ثابت کرنے کے لیے ضروری ہے۔

ان کے علاوہ 'پروفیسر شمیم نکہت' 'نیر ضیہ سجاد ظہیر، عارف نقوی، استانی جی، قمر صاحب وغیرہ کے خاکے لکھے۔ 'بیگم حمیدہ سلطان' کا خاکہ 'زلیخا بیگم' نہایت اہم ہے۔ زلیخہ بیگم یوسف کی زلیخا نہیں بلکہ مولانا ابوالکلام آزاد کی شریک حیات ہیں۔ صغرا مہدی نے ڈاکٹر عابد حسین کا خاکہ لکھا، حمید اختر حسین رائے پوری نے 'ہمارے مولوی صاحب' کے عنوان سے مولوی عبدالحق کا خاکہ لکھا، بلند اقبال بیگم (بنت یگانہ) نے 'بھائی ابا' کے عنوان سے خاکہ لکھا۔ ان خاتون خاکہ نگاروں نے خاکہ نگاری کی روایت کو آگے بڑھایا اور ان کے خاکے بھی ہمارے ادب میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

مندرجہ بالا مطالعے سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ خواتین خاکہ نگاروں نے اردو ادب میں نہ صرف اپنی موجودگی کو ثابت کیا بلکہ خاکہ نگاری جیسے فن کو نئے زاویوں اور تہذیبی حوالوں سے ہم آہنگ کیا۔ ان کے خاکوں میں سماجی شعور، نفسیاتی گہرائی اور فنی شعور کی آمیزش نمایاں طور پر محسوس کی جا سکتی ہے۔ دیگر خواتین نے جن شخصیات کو موضوع بنایا ان کی پیشکش میں صرف تاثر نہیں بلکہ تحقیقی بصیرت مشاہدے کی گہرائی اور بیانیہ کی دلکشی بھی ملتی ہے۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ خواتین نہ صرف ادبی اظہار کی ماہر ہیں بلکہ خاکہ نگاری جیسے باریک فن میں فکری رہنمائی کی صلاحیت بھی رکھتی ہیں۔

لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ خواتین کی تحریری و تخلیقی کاوشیں اس صنف کو مزید وسعت دیں گی۔

□□□

Samreen Bano
Research scholar
University of Allahabad
46/32 Baba Ji ka Bagh
Near Shakti Coaching, Behind Indian press
Prayagraj- 211002 (U.P)
Mobile :7905914635
Email :Samreenansari87324@ gmail.com

ناول 'زوال' کا تجزیاتی مطالعہ

مسرت جہاں

عبدالصمد کا تازہ ترین ناول 'زوال' ہے۔ فکشن کے لیے یہ موضوع کوئی نیا نہیں ہے اور نہ ہی معتبر، لیکن حساس ہے۔ اس کا موضوع اخلاقی انحطاط اور نسلوں کی بے راہ روی جیسے موضوعات پر مبنی ہے۔ اخلاقی گراوٹ اور وجود میں آنے والی نسلوں کی بے راہ روی کو ہر دور میں سماجی انحطاط کا فکریہ پہلو سمجھا جاتا رہا ہے۔ اسی لیے ڈپٹی نذیر احمد، مرزا ہادی رسوا اور پریم چند نے ان سنجیدہ مسائل کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا ہے۔ عبدالصمد نے متعدد ناول اور افسانے لکھے ہیں۔ ناول اور افسانہ دونوں یکساں فنی صلاحیت کے حامل ہیں۔ اُن کے افسانوی مجموعوں— 'بارہ رنگوں کا کمرہ، پسِ دیوار، سیاہ کاغذ کی دھجیاں، میوزیکل چیئر، آگ کے اندر راکھ، دمِ واپسی اور بہ قلم خود....' وغیرہ میں انسانی تجربات کے کئی جہات نہایت موثر پیرائے میں جلوہ گر ہوئے ہیں۔ اسی طرح اُن کے متعدد ناول 'دوگز زمین، مہاتما، مہاساگر، شکست کی آواز، کشکول، بکھرے اوراق، جہاں تیرا ہے یا میرا، اجالوں کی سیاہی، دھمک، سسٹم اور لازوال' اپنی انفرادیت اور معنوی وسعت کے باعث اردو فکشن کا نہ صرف سرمایہ ہیں بلکہ سنگ میل سمجھے جاتے ہیں۔

ان ناولوں میں مختلف سماجی و تہذیبی مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ناول 'مہاتما' میں تعلیم سے متعلق مباحث ہیں۔ ناول 'کشکول' عالمی وبا کووڈ-19 کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ ناول 'دوگز زمین' تقسیمِ وطن کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بے وطنی، کرب اور انسان دوستی کی نئی جہتوں پر مشتمل ہے۔ اسی سلسلے کا ناول 'زوال' ہے جو عملِ باطل، اخلاقی انحطاط اور نسل کی بگاڑ جیسے حساس موضوعات کو بنیاد بنا کر عبدالصمد نے معاصر معاشرتی زوال کے کئی پہلو نہایت باریک بینی سے اُجاگر کیے ہیں۔ یہ تمام تخلیقات اُن کے فکشن کی فکری گہرائی، موضوعاتی تنوع اور فنی مہارت کا بین ثبوت ہیں۔

ناول 'زوال' عملِ باطل کا نہایت مؤثر اور تہہ دار مرقع پیش کرتا ہے۔ اس کہانی کی بنیاد نو دولتیے طبقے میں پنپنے والی اُن اخلاقی کجرویوں اور رذائل پر رکھی گئی ہے جو سماجی و تہذیبی انحطاط کی علامت سمجھی جاتی ہیں۔ سلطان گڑھ کا نین سکھ پرتاپ— جسے فادر فگر کی حیثیت حاصل ہے— اپنی ظاہری آرائش، نمود و نمائش اور شہزادوں و راجاؤں کے وضع دار شوق و ذوق کا پروردہ ہے۔ شکار، کھیلنا، کار ریس اور شہوانی لغزشیں اور امیروں کے مخصوص دل چسپ مشاغل اسے راجہ نین سکھ پرتاپ کی قبا میں ملبوس کر دیتا ہے۔ یہی میلانات اس کی نام نہاد خوش ذوقی کا رخ متعین کرتے ہیں اور مجموعی طور پر اس طبقے کے اخلاقی انہدام کو نمایاں کرتے ہیں۔

ناول نگار نے اس ناول کو دو واضح حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصہ خاصا طویل ہے اور تقریباً ایک تہائی حصے پر محیط ہے۔ اس حصے میں دو خاندانوں کی زندگیوں کو باہم متوازی خطوط پر پیش کیا گیا ہے، جہاں ہر خاندان اپنی داخلی مصروفیات، الجھنوں اور سماجی رویوں کے حصار میں جکڑا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ راجہ نین سکھ پرتاپ کی شخصیت میں روایتی راجاؤں اور مہاراجاؤں کی تمام اخلاقی و عملی خامیاں شدت کے ساتھ موجود ہیں۔ جس کی ایک جھلک درج ذیل

عبارت سے نمایاں ہوتی ہے۔:

''راجہ صاحب نے شادی بس ایک ہی کی تھی... راجہ صاحب کا کوئی باقاعدہ حرم تو نہیں تھا مگر ان کی محل نما حویلی میں بے شمار عورتیں کام کرنے کے بہانے رکھی گئی تھیں۔ ویسے یہ بات سبھی جانتے تھے کہ لگ بھگ یہ سبھی عورتیں ان کی رکھیلیں تھیں۔ راجہ صاحب کو جوان خوبصورت عورتوں کا بہت شوق تھا۔'' (ص9)

اوپر کی عبارت سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ راجا صاحب کے عادات و اطوار کس قدر بے مہار اور ان کے ذوق کس نوعیت کے تھے۔ راجا کی شخصیت کا بنیادی محور محض جمالیاتی رغبت نہیں بلکہ عورت کو ایک شے تصور کرنے والی وہ ذہنیت تھی، جو خواہشِ نفسانی کی تسکین کے لیے بے دریغ استعمال کرتا ہے۔ اُن کے لیے عورت کی کوئی مخصوص عمر یا حد نہیں تھی، بس پسند آ جانا کافی تھا، پھر وہ عورت خواہ کسی پس منظر سے ہو، اُس کی ہوس کا نشانہ بن جاتی ہے۔

البتہ مصنف نے فنی ہنرمندی کے ساتھ یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ راجا پرتاپ کا کردار محض ذاتی بدعنوانی کا نمائندہ نہیں بلکہ اُس زوال پذیر جاگیردارانہ ذہنیت کا استعارہ بھی ہے جو اخلاقی حدود کو کسی اہمیت کا حامل نہیں سمجھتا ہے۔ اس حصے میں کرداروں کے باہمی تعلقات، گھریلو سیاست، اور سماجی تفاوت کا پُر اثر تجزیہ پیش کیا گیا ہے، جو نہ صرف اس طبقے کی داخلی کمزوریوں کو آشکار کرتا ہے بلکہ پورے سماجی منظرنامے کی تہہ در تہہ پرتیں بھی کھولتا ہے۔

راجا صاحب نے مختلف شہروں میں کوٹھیاں تعمیر کروا رکھی تھیں جہاں اُن کی کچہریاں قائم تھیں۔ ان مراکز سے محصول کی آمدنی آتی اور جاگیرداری کے تحت غلّہ وصول کیا جاتا تھا۔ اصل میں یہی اس کی دولت، عیش اور اقتدار کا اصل ذریعہ تھا۔ انہی کوٹھیوں میں نوع بہ نوع داشتاؤں کا ایک سلسلہ بھی برقرار تھا جن میں ایک مسلمان طوائف (صابرہ خاتون،) نہایت حسین و جمیل تھی۔ اسی کے سبب شہر کی سب سے مہنگی طوائف سمجھی جاتی تھی۔ اس کی آمدنی دیگر طوائفوں سے کہیں زیادہ تھی، مگر راجا صاحب کے ذوقِ انتخاب کے سامنے مال و زر کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔

صابرہ خاتون نے راجا صاحب کی رغبت کے جواب میں دو واضح شرطیں پیش کیں۔ پہلی شرط یہ کہ وہ اس سے باقاعدہ نکاح کریں، اور دوسری یہ کہ اس سے پیدا ہونے والی اولاد کی پرورش اور تربیت اُس کے مذہب اور تہذیبی اصولوں کے مطابق ہوگی۔ راجا صاحب نے یہ دونوں شرطیں منظور کرلیں۔ یوں نکاح کے بعد وہ بطورِ منکوحہ سلطان گڑھ کی حویلی میں لے لائی گئیں۔۔

اس رشتے سے چار اولادیں پیدا ہوئیں جن کی تعلیم و تربیت نہایت شاہانہ انداز میں کی گئی۔ حویلی میں ان کا سلوک راجکماروں جیسا تھا۔ مزید اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے انھیں انگلینڈ بھیجا گیا، جہاں انھیں مغربی طرزِ زندگی کی خیرہ کن آزادیوں نے ایسے الجھا دیا کہ شب و روز نائٹ کلبوں، شراب نوشی اور دیگر رنگ رلیّوں میں ہی گزرتے رہے۔ اس طرح اُن کی تربیت کا یہ مرحلہ عیش و عشرت کے ایک نئے باب میں تبدیل ہوگیا۔

مزید برآں، یہ چاروں بھائی ماں کی وفات کے بعد مایوسی اور ناکامی کے احساس کے ساتھ وطن واپس لوٹے۔ عملاً وہ زندگی کے کسی بھی عملی میدان میں قدم رکھنے کی ہمت نہ کر سکے۔ اگرچہ وہ متعدد منصوبے بناتے رہے مگر کوئی بھی راستہ انھیں عمل تک نہ لا سکا، نتیجتاً وہ پوری طرح اسٹیٹ کی جاگیرداری پر ہی منحصر رہے۔ رفتہ رفتہ اس وسیع تر ریاست کی بنیادیں کمزور پڑتی گئیں اور ان کے معاش کا سہارا زمین جائیداد، حویلیاں، زیورات اور قیمتی سامانوں کی فروخت تک محدود ہو کر رہ گیا۔ اس انحطاط کا اثر کس قدر گہرا تھا، اس کا اندازہ حویلی کے ڈرائیور کے ان لفظوں سے ہوتا ہے:

''باہر میاں پنج ہزاری، اندر بیوی بھوکوں ماری۔ اب کچھ نہیں رہا ان کے پاس۔ زمینداری ختم ہوئی تو ان لوگوں نے اپنی جھوٹی شان کو برقرار رکھنے کے لیے اندھا دھند پراپرٹی اور زمینداری کے باؤنڈ بیچنا شروع کر دیے۔ مختلف شہروں میں کوٹھیاں حویلیاں تھیں، وہ بھی بکیں؛ باغات تھے، وہ ہاتھ سے نکلے؛ قیمتی فرنیچر، قالین، زیور، سونے چاندی کے برتن

وغیرہ فروخت ہوتے گئے۔'' (ص 218)

اس مرحلے پر مصنف نہایت فنی مہارت کے ساتھ زوال پذیر جاگیردارانہ پس منظر کی وہ سچی تصویر پیش کرتے ہیں جہاں اقتدار کے زعم میں پلنے والی نسلیں جب عملی زندگی کے کسی مضبوط سہارے سے محروم ہو جائیں، تو سارا سرمایہ محض نمود و نمائش میں پگھل کر رہ جاتا ہے۔ خاندان اپنی سابقہ شان و شوکت کا بوجھ اٹھاتے اٹھاتے اندر سے کھوکھلا ہو جاتا ہے، اور تمام اثاثے بتدریج تحلیل ہوتے چلے جاتے ہیں۔

اس کہانی کا دوسرا خانوادہ شرف الدین کا ہے، جو اپنی طبیعت میں نہایت شریف النفس مگر ساتھ ہی اپنے عہد کا نباض بھی ہے۔ اس کے اندر لوگوں کے مزاج، حالات اور مسائل کو سمجھنے کی غیر معمولی صلاحیت موجود ہے۔ یہی سبب ہے کہ وہ چھوٹے بڑے سبھی معاملات کو نہایت حکمت اور تہذیب کے ساتھ سلجھانے کا ہنر رکھتا ہے۔ شرف الدین بیک وقت حویلی کے پیچیدہ انتظامات اور اپنے گھریلو امور دونوں پر گہری اور پارکھی نظر رکھتا ہے۔ حویلی میں راجا، رانی اور راجکماروں کے سامنے جن اعتماد اور اعتبار کی بنیاد اس نے برسوں میں قائم کی تھی، اسے وہ آخر دم تک پوری وفاداری کے ساتھ نبھاتا رہا۔ اگر کبھی اس سے کوئی لغزش ہو جاتی یا کسی معاملے میں حد سے ذرا سا تجاوز ہو جاتا، تو وہ فوراً راج خاندان کے مزاج اور نظریے کو سمجھ کر اپنے رویّے کی اصلاح کر لیتا ہے۔ ایسے مواقع پر وہ مؤدبانہ انداز میں ''یور ہائی نیس'' کہہ کر خود کو اُن کے حکم اور اختیار کے تابع کر دیتا ہے۔ یوں اس کی دانائی، اپنی حدوں کی پہچان، اور وفادارانہ خدمت نے اسے حویلی کے اندر ایک ناقابلِ تردید مقام عطا کر دیا تھا۔

شرف الدین حویلی کا بظاہر ایک معمولی ملازم ہے، مگر اس کی غیر معمولی امانت داری، وفاداری اور معاملات کو سنبھالنے کی صلاحیت نے رانی صاحبہ کی توجّہ اپنی جانب مبذول کر لی اور رانی صاحبہ نے اسٹیٹ کے تقریباً تمام اہم امور شرف الدین کے سپرد کر دیے۔ اس ذمہ داری نے اس کی حیثیت کو محض حویلی تک محدود نہ رکھا بلکہ پوری اسٹیٹ اور گاؤں بھر میں اسے قدر کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔

دلچسپ امر یہ ہے کہ اس غیر معمولی اعتماد اور اثر پذیری کا شرف الدین کی شخصیت پر کوئی اثر نہ پڑا؛ وہ بدستور منکسر المزاج، ذمہ دار اور سادہ طبیعت کا انسان رہا۔ تاہم اس کے بچوں میں یہ احساس ضرور پیدا ہونے لگا کہ اب وہ ایک برتر اور معزز طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ حویلی میں شرف الدین کی عزت بڑھنے کے ساتھ اس کی بیٹیوں کے رشتے بھی اچھے خاندانوں میں طے ہونے لگے۔

شرف الدین کے دو بیٹے، سلیم اور اشفاق، نئی نسل کی نمائندگی کرتے ہیں۔ سلیم اگرچہ تعلیم یافتہ ہے۔ بی پی ایس سی امتحان میں کامیابی حاصل کر کے آفیسر کے عہدے پر فائز ہے۔ لیکن اس کی شخصیت غرور اور خود پسندی سے لبریز ہے۔ اس کے برعکس اشفاق موجودہ دور کا بیدار فکر، عملی ذہن رکھنے والا اور جدید تقاضوں سے پوری طرح واقف نوجوان ہے۔ وہ نئے طریقوں اور زمانے کی تیز رفتار دھڑکنوں کو سمجھنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ اشفاق حویلی کا عملی نمائندہ ہے، جو زمینوں، جائیدادوں اور زیورات کی فروخت جیسے اہم معاملات میں ملوث رہتا ہے اور لین دین میں اس کا اپنا مفاد بھی شامل ہوتا ہے۔ شرف الدین اپنے دونوں بیٹوں کے رویّوں اور حرکتوں سے رنجیدہ ہوتا ہے، مگر وقت کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے موقع بہ موقع انہیں سمجھانے کی کوشش بھی کرتا ہے۔

''دیکھو بیٹا جب پیسہ نمبر ایک پوزیشن پر آ جائے تو پھر ساری چیزیں اپنے آپ راستہ بھول جاتی ہیں۔ جب احساس ہی مردہ ہو جائے تو پھر رشتہ اور رشتہ دار کہاں! اس لیے تو میں تم لوگوں سے بار بار کہتا ہوں، پیسے کو سر کا تاج مت بناؤ۔ پیسہ ہاتھ کا میل ہوتا ہے آیا اور گیا۔'' (ص 132)

ناول کا دوسرا حصہ اینٹی کلائمکس کی کیفیت سے عبارت ہے، جہاں حویلی کی استحصال زدہ اور بند فضا میں ہر شخص کسی نہ کسی بیزاری، تنہائی اور داخلی شکست میں گرفتار ہے۔ چاہے وہ پرنس ہو، بے بی ہو یا کوئی ملازمہ — سب اپنی اپنی المناک روداد لیے بیٹھے ہیں، اور یہ تمام قصے حویلی کی گھٹن زدہ دنیا کے جمود اور بے معنویت کو آشکار کرتے ہیں۔

حویلی کے افراد کا بیرونی دنیا سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ ایک نامعلوم شخص جو محض دولت کی حرص و ہوس کے تحت حویلی میں آنے جانے کا سلسلہ قائم کرتا ہے۔ رفتہ رفتہ اس کی قربت پرنس سے بڑھتی جاتی ہے اور پرنس ہر ملاقات میں اپنی زندگی کے نئے گوشے اس کے سامنے کھولتی چلی جاتی ہے۔ یوں وہ شخص حویلی کے مخفی معاملات سے آشنا ہوتا ہوا اس کا ہمراز بن جاتا ہے۔ پرنس کی بے تکلفی اور حویلی کی داخلی افراتفری کا اندازہ پرنس کے ان جملوں سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے، جو اندرونِ خانہ میں رونما ہونے والے حالات کی خاموش ترجمانی ہے:

''میں نے اپنے گھر کو اینمل فارم کہا تو غلط نہیں کہا۔ جارج آرویل نے بہت اچھا نام دیا ہے میرے گھر کو۔ میرے گھر میں بہت سے مرغے مرغیاں ہیں۔ کوئی بتا سکتا ہے کون مرغا، کون مرغی، کس کی اولاد ہے۔'' (ص 245)

اوپر کی عبارت سے یہ حقیقت پوری طرح منکشف ہوتی ہے کہ باطل افعال اور گمراہ کن رویّے نسلوں کی تباہی اور اخلاقی انحطاط کا بنیادی سبب بنتے ہیں۔ انسان کو اشرف المخلوقات کا درجہ حاصل ہے۔ اس کے اندر عقل، شعور، تمیز اور خیر و شر کی پہچان کی وہ صلاحیت موجود ہے جو اسے دیگر مخلوقات سے ممتاز کرتی ہے۔ یہی شعوری امتیاز انسان کو حیوانی جبلّتوں اور وحشیانہ حرکات سے باز رکھتا ہے اور اسے ایک مہذب، باوقار اور ذمہ دار وجود بننے کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔

یہ کہانی دراصل وقت کے مسلسل بدلتے ہوئے حالات اور سماجی ارتقاء کی عکاس ہے۔ کبھی راجا، رانی اور راجکمار کہلانا طاقت، وقار اور سماجی برتری کی ضمانت سمجھا جاتا تھا، مگر وقت کے دھارے نے یہ تمام تصوّرات یکسر بدل دیے ہیں۔ زمانہ آگے بڑھا، ترقی نے نئی صورت اختیار کی اور انسان کے شعور، طرزِ زندگی اور معاشرتی اقدار میں گہری تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ انہی بدلتے ہوئے حالات میں، راجکمار اب "پرنس" اور راجکماری "پرنسس" کے نام سے پہچانے جانے لگے - یہ محض زبان کی تبدیلی نہیں ہے، پورے سماجی ڈھانچے کے بدل جانے کا اشارہ ہے۔ راج پاٹ کے زوال کا عالم یہ ہے کہ حویلیاں جنہیں کبھی اقتدار اور شان و شوکت کی علامت سمجھا جاتا تھا، اب ختم ہو کر فلیٹوں میں تبدیل ہو چکی ہیں۔ وہ تمام وسیع و عریض زمینیں، باغات اور محلات جو کبھی ریاست کی شناخت تھے، اب شہری ضرورتوں کے تحت رہائشی عمارتوں میں ڈھل گئے ہیں۔ یوں حویلی کی دنیا تحلیل ہو کر جدید شہری زندگی کا حصہ بن گئی ہے اور یہی نئی طرزِ زندگی اب ان افراد کی خوشی اور آسایش کا ذریعہ ہیں۔

مختصر یہ کہ 'زوال' کا محور و مرکز 'طوائف' ہے، گرچہ پوری کہانی میں اور کئی طوائفوں کا ذکر ہے۔ کسی خاص تکنیک کا استعمال نہیں ہے۔ عام فہم انداز ہے۔ پیچیدگی سے مبرا سیدھی سادی تکنیک ہے۔ کہانی کی مناسبت سے فطری طور پر تکرار پیدا ہو جاتی ہے، مگر الجھاؤ کہیں نہیں ہے۔ اس کی زبان عام سی سادہ سلیس اور رواں ہے۔ بیک وقت کہانی کار کو اردو، ہندی، انگریزی کے علاوہ اور دوسری زبانوں کے استعمال پر غیر معمولی دسترس ہے۔ ہر جز کی عکاسی کے لیے لفظوں کے استعمال اور جملوں کی دروبست میں ان لفظوں کی مدد جیسے تجہیز و تکفین، مرعوبیت، مضمحل، متحمل، بادل نخواستہ، قلا بازیاں، کسٹوڈین، اینمل فارم، آرنامنٹس، میڈ سرونٹس، اتم سنسکار، گمبھیر، گندھر وا، بیاہتا، جھپٹا مارنا، نالائق، چار سو بیس وغیرہ کے استعمال سے جزئیات نگاری کی بھرپور ترجمانی ہوتی ہے جو راجارانیوں کے ذوق و شوق اور دوسرے کرداروں کے اندرون میں پل رہی ہیجانی کیفیت، نفرت اور بغاوت کی ترسیل خود بخود ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہ الفاظ آپس میں اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ بار بار طوائفوں کے ذکر کے باوجود قاری کو اکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی ہے اور تجسس قائم رہتا ہے۔ ایک ایک جز اتنی باریکی سے بیان ہوا ہے کہ کہ پوری تصویر پردے پر چلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ یہی خصوصیت مصنف کو ان کے ہم عصروں سے ممتاز اور نمایاں مقام عطا کرتی ہے۔

□□□

Musarrat Jahan
Assistant Professor
Dept. of Urdu
Patna University, Patna- 800005 (Bihar)

شائقہ آفرین

خواتین کے افسانوں میں خواتین کے مسائل

آزادی کے بعد خواتین کے افسانے تیزی سے منظرعام پر آنے لگے۔ 1960 کے بعد وہ مرد افسانہ نگاروں کے شانہ بہ شانہ چلنے لگیں۔ 1970 کے بعد خواتین افسانہ نگاروں میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ ان کے افسانے ملک کے ادبی رسائل میں کافی تعداد میں شائع ہونے لگے اور ان کے بہت سے افسانوی مجموعے بھی منظرعام پر آئے لیکن تنقید نگاروں اور تحقیق کاروں نے ان پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔

بہار میں بھی خواتین کے افسانے تیزی سے شائع ہونے لگے۔ انھوں نے ہر طرح کے افسانے لکھے۔ ان کے افسانوں میں نسوانی کرداروں کو بہتر طریقے سے پیش کیا گیا ہے۔ گھریلو الفاظ، گھریلو زبان، گھریلو محاورے اور گھریلو ضرب الامثال پر عورتوں کی گرفت زیادہ مضبوط ہوتی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ انھوں نے بہت سے گھریلو الفاظ کو وقار عطا کیا ہے تو غلط نہ ہوگا۔ رسم و روایات اور رہن سہن کے طور طریقے سے بھی خواتین اچھی طرح واقف ہوتی ہیں۔ قدرت نے انھیں افسانہ طرازی کا ملکہ عطا کیا ہے۔ فطری طور پر قصہ گوئی سے شغف رکھتی ہیں۔ خود بھی کہانی سننا اور بچوں کو بھی کہانی سنانا ان کی فطرت میں شامل ہے۔ بہار کی خواتین نے اردو فکشن میں بہتر کام کیا ہے لیکن دو چار خواتین افسانہ نگاروں کے علاوہ باقی کے بارے میں کم ہی لوگ واقف ہیں۔ اکیسویں صدی میں ان پر کچھ کام ہوا ہے۔ میں نے اپنے اس تحقیقی و تنقیدی مضمون میں خواتین کے افسانوں میں خواتین کے مسائل تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ وابستہ بہار کی خواتین افسانہ نگاروں میں شکیلہ اختر کا نام بڑے ہی ادب و احترام سے لیا جاتا ہے۔ ان کے زیادہ تر افسانے عورتوں کی نفسیات کے آئینہ دار ہیں۔ وہ اپنے افسانوں میں عورتوں کی نفسیات کو پیش نظر رکھ کر کرداروں کے حرکات و سکنات کو آگے بڑھاتی ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں بہار کے متوسط گھرانوں کی ایسی تصویریں کھینچی ہیں جن کے چہروں پر اداسی اور مایوسی کے ساتھ ساتھ امید و بیم دیے ٹمٹماتے نظر آتے ہیں۔

شکیلہ اختر نے اپنے بعض افسانوں میں اپنے ہی جذبات و احساسات کو فنکاری کے ساتھ قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔ وہ اپنی ذات کے کرب کو وسعت دے کر ہمہ گیر بنا دینا چاہتی تھیں۔ ان کے بہت سے افسانوں میں داخلیت کا احاطہ بہت وسیع ہو گیا ہے اور محرومی اور نامرادی کے احساسات ہمہ گیر بن گئے ہیں:

> ”تمھارے جانے کے بعد اس اکیلے کبوتر کی طرح کھلے آسمان کے نیچے۔ مجبور و لاچار، صرف تمھاری یادوں کا ایک سہارا ہے..... اپنی موت کا انتظار کر رہی ہوں۔ میرے پاس تو ایک دیوار بھی نہیں ہے جہاں تمھاری تصویر لگا کر اسے

پھولوں سے سجاتی۔ تمھاری ہنستی مسکراتی ساری تصویروں کو میں نے اپنی آنکھوں میں سجالیا ہے۔ تمھاری تصویریں میری نگاہوں میں مسکراتی ہیں تو میرے اندر آنسوؤں میں تمھارا تنکوں کا آشیانہ ڈوبا ہوا، بکھرا بکھرا سا نظر آتا ہے اور کہیں دور بہت دور سے ایک آواز سنائی دیتی ہے۔''دنیا رین بسیرا۔ دنیا رین بسیرا'' (افسانہ''تنکوں کا آشیانہ''، شکیلہ اختر)

اعجاز شاہین ایک ایسی افسانہ نگار تھیں جن کے دل میں عورتوں کا درد و کرب چھپا ہوا تھا۔ وہ اپنے افسانوں میں عورتوں کے مسائل کو نہ صرف پیش کرتی ہیں بلکہ ان کا حل بھی تلاش کرتی ہیں۔ وہ بے بس، مظلوم اور استحصال زدہ عورتوں کو اوپر اٹھانے کی کوشش کرتی ہیں۔ انھوں نے ایک جگہ خود لکھا ہے کہ میرے اکثر افسانوں کا موضوع بے بس، مظلوم عورت ہے۔ میں نے تڑپتی، سسکتی عورت کو دیکھا ہے اور ان مردوں کو بھی جو عورتوں کا حق دبائے بیٹھے ہیں۔ انھیں کبھی سماج کا خوف دلا کر ڈراتے ہیں اور کبھی مذہب کا سہارا لے کر ان پر ظلم و ستم ڈھاتے ہیں۔ بے چاری عورت جو سراپا ایثار و وفا سے اکثر اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ اس نے اپنا حق پالیا ہے حالانکہ جائز حق کے لیے ابھی اسے پورے سماج سے لڑنا ہے۔ متحد ہوکر آواز اٹھانا ہے۔

ڈاکٹر قیام نیر نے کتنا درست فرمایا ہے:

''اعجاز شاہین نے اپنے افسانوں میں ان عورتوں کی بے بسی کا ذکر تو کیا ہی ہے جو حالات کی ماری ہوئی اور ستائی ہوئی ہیں ساتھ ہی انھوں نے بیداری نسواں کے لیے بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ گھٹ گھٹ کر جینے والی عورتوں میں ایک نئی طاقت اور ایک نیا عزم پیدا کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ آج کی عورتیں ہر میدان میں قدم سے قدم ملا کر چل رہی ہیں لیکن آج بھی بہت سی عورتیں ایسی ہیں جو باہر کی دنیا سے بے خبر ہیں۔ آج بھی وہ گھٹ گھٹ کر جینے پر مجبور ہیں۔''

(بہار و جھارکھنڈ میں اردو افسانہ اور افسانہ نگار، جلد دوم، ڈاکٹر قیام نیر، ص:25)

اس اقتباس سے اعجاز شاہین کے افسانوں میں عورتوں کے درد و غم کو محسوس کیا جا سکتا ہے:

''صبح سویرے نوکر جب چولہے کی راکھ پھینکنے پچھلے دروازہ پر آیا تو دروازہ کھلا دیکھ کر چونکا.....جب راکھ نالے میں ڈالنے جا رہا تھا کہ اس کی نظر اس گٹھری پر پڑی.....وہ چیختا ہوا گھر کے اندر آیا اور افسوس ناک خبر سنانے کے لیے مڑا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے، زبان میں لرزش تھی۔ بڑی بہو نے پوچھا''عباس کیا ہوا رے'' اس نے روتے ہوئے شکل سے کہا.....''بڑی بیگم صاحبہ.....تو باہر نالے میں مری پڑی ہیں۔'' ہائے! آج تو شنو کی بارات آنے والی ہے۔ پھر وہ بڑے غصے میں یہ کہتے ہوئے شوہر کو اطلاع دینے چلی گئیں۔ انھوں نے زندگی میں بھی موقع اور مصلحت کو نہیں سمجھا.....توبہ ہے میری بھی تو.....'' چھوٹی بہو الگ ہراساں تھیں کہ ان کو کیچڑ بڑے نالے سے نکالے گا کون۔

صرف ایک عباس تھا جو روئے جا رہا تھا۔''

(افسانہ آج کی نسلیں۔ اعجاز شاہین)

امتیاز فاطمی عورتوں ہی کو اپنے افسانوں میں پیش کرنے کی کوشش کرتی ہیں جو حالات کی ماری ہوئی چپ چاپ دبکی پڑی ہیں۔ مصنفہ کا خیال ہے کہ اگر عورت چاہے تو اپنی قسمت بدل سکتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو بدلے کیونکہ صرف سانس لے کر زندہ رہنا زندگی نہیں ہے۔ ان کے افسانوں میں عورتوں کے استحصال کو موضوع بنایا گیا ہے۔ وہ عورتوں کے اندر دینی تعلیم کو بھی عام کرنا چاہتی ہیں۔ انھوں نے خود لکھا ہے:

''عورت معاشرے کا ہمیشہ ایک کمزور پہلو تصور کی جاتی رہی ہے۔ اس لیے جہاں تک میرا خیال ہے محرومی، غلامی اور بے چارگی عورت کا مقدر بنادی گئی ہے۔ آج بھی وہ اسی جگہ کھڑی ہوگئی ہے جہاں صدیوں پہلے تھے۔ اس کی انا اور شخصیت سماج کے بنائے ہوئے اصولوں کے تحت ہمیشہ کچلی جاتی رہی ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ اس حقیقت سے بھی انکار کی گنجائش نہیں ہے کہ اگر گرد لپٹی ہوئی محرومی، تنہائی،

اداسی اور مجبوری کی اس مکروہ زنجیر کو توڑنے کی یا اس حصار سے باہر نکلنے کی خود عورت نے بھی کوشش نہیں کی ہے۔''

(بحوالہ بہار وجھارکھنڈ میں اردو افسانہ.....ڈاکٹر قیام نیر، ص:69)

کہکشاں انجم نے اپنے افسانوں کے ذریعہ خواتین کو ایک نئی روش دکھانے کی کوشش کی ہے۔ وہ اپنے قارئین کو یہ پیغام دینا چاہتی ہیں کہ مرد اور عورت کو الگ الگ خانوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا ہے۔ وہ سماج کے بنائے ہوئے غلط رسم ورواج، اندھی عقیدت اور بوسیدہ روایتوں کے اندھیروں کو روشنی میں بدلنے کی کوشش کرتی ہیں خاص کر سرتاج اور کنیز کے رویہ کو بدل کر شریک حیات کی جگہ شریک زندگی دیکھنا چاہتی ہیں۔

شیریں نیازی نے اپنے افسانوں میں مزدور طبقوں کی زندگی کے دکھ درد، عورتوں کی نفسیات اور سماجی تبدیلی کو موضوع بنانے کی کوشش کی ہے ۔ اس چھوٹے سے اقتباس کے ذریعہ عورتوں کی حالات زندگی کو سمجھا جا سکتا ہے۔

''سسرال کی چوکھٹ پر قدم رکھتے ہی مسکراہٹیں ابلے ہوئے دھان اور ان کے نیچے جلتی ہوئی آگ کے نیچے دب جایا کرتیں ۔لیکن کبھی آنسوؤں کی کوئی بوند ٹپکتی بھی تو گرم راکھ بن کر ہمیشہ کے لیے راکھ بن کر خاموش ہو جایا کرتی! پر ان کا اپنا کچھ بھی نہیں بچتا۔''

(افسانہ''ریزہ ریزہ''، شیریں نیازی)

ذکیہ مشہدی کا محبوب موضوع ہے عورتوں کی نفسیات کا مطالعہ۔ خانگی زندگی پر انھوں نے بہت سے افسانے لکھے ہیں۔ طوائفوں کی نفسیات پر بھی انھوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ عورتوں کی زبان استعمال کرنے اور عورتوں کے جذبات کی عکاسی کرنے میں وہ صالحہ عابد حسین اور جیلانی بانو کے بہت قریب ہیں۔ ان کے ایک افسانے کا اقتباس دیکھیے:

''اس کی شادی کے دو چار روز بعد ان کا چھوٹا بھائی پہل پھیرے کی رخصتی کرانے آیا تھا۔ اس نے کچے آنگن والے کھپر پوش گھر پر کچھ کچھ پریشان نظریں ڈالیں، تنہائی میں بہن سے بولا۔''آپا! ایسے گھروں میں ہمارے یہاں مویشی باندھے جاتے ہیں میاں نے کیا دیکھ کے......''۔امی نے اسے جملہ پورا کرنے نہیں دیا کس ہاتھ سے اس کا منہ دبا دیا۔''خبردار آگے ایک لفظ منہ سے نہ نکلے اور اگر گھر جا کر میاں سے کچھ کہا تو میرا مرا منہ دیکھو گے۔''

(افسانہ''بکسا''، ذکیہ مشہدی)

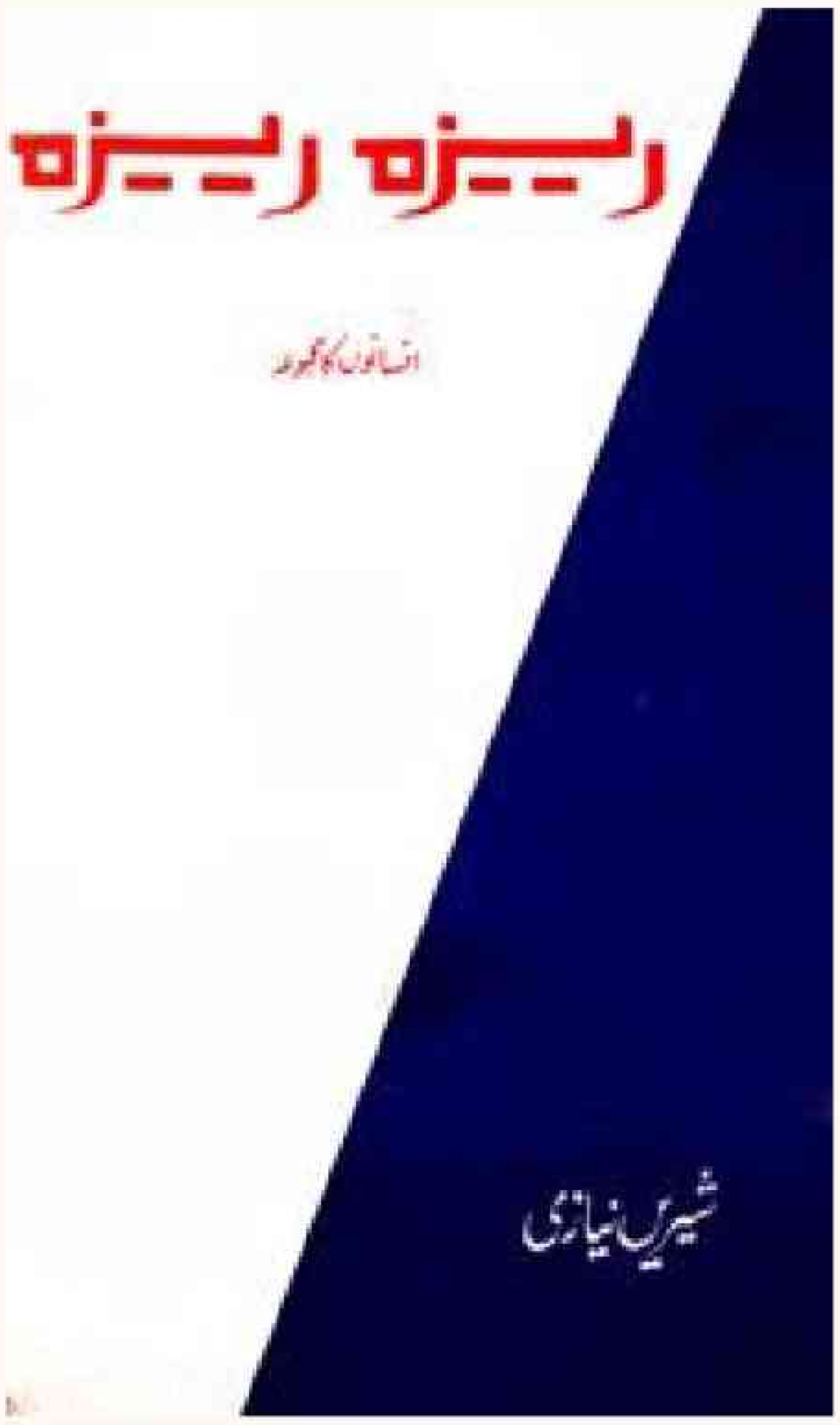

ڈاکٹر قمر جہاں نے مختلف موضوعات پر افسانے لکھے ہیں لیکن عورتوں کا استحصال اور جہیز کی لعنت ان کا پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ حالیہ چند برسوں میں مصنفہ نے جو افسانے لکھے ہیں ان میں تعلیم یافتہ برسر روزگار عورت کی بکھری ہوئی حالت، ان کا ذہنی انتشار اور جذباتی آسودگی وغیرہ کو دکھانے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے ایک جگہ اپنے افسانوں کے بارے میں خود لکھا ہے کہ آج عورتوں کو ان کی تعلیم نے ایک نئی زندگی، بالیدہ شعور، ایک قابل رشک سماجی مرتبہ ضرور دے دیا ہے مگر خود اپنی چہار دیواری، اپنے گھر آنگن میں وہ آج پہلے سے زیادہ الجھ کر، بکھر کر رہ گئی ہیں۔ ان کی حالت کہیں کہیں بے حد تشویس ناک ہوتی جا رہی ہے۔

ڈاکٹر قمر جہاں کے افسانوں میں عورتوں کی زندگی کے انھیں رخوں سے زیادہ دلچسپی دکھائی دیتی ہے ۔ وہ خود اپنی شخصیت کو کس طرح ریزہ ریزہ کر رہی ہیں ۔

’’کچھ رشتے بنتے ہی ہیں ٹوٹنے کے لیے .....فکر نہ کرو بیٹی! میں ہوں نا۔‘‘ بابا کے یہ بول سنتے ہی اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب امڈ پڑا تھا۔ وہ زور زور سے ہچکیاں لینے لگی۔قریب کھڑی اماں کی آنکھیں بھی جل تھل تھیں مگر وہ کر ہی کیا سکتی تھیں۔ انھوں نے ایک گہری نظر بیٹی پر ڈالی جو صوفے میں دھنسی جارہی تھی۔ اس کے چہرے کے گلاب مرجھا چکے تھے اور آنکھوں کی شراب لٹ چکی تھی۔انھوں نے سوچا ،لڑکیوں کا حسن بھی کتنا بے اعتبار ہوتا ہے۔ ابھی کل ہی کی بات تو ہے اس کی آنکھیں کیسی مدبھری تھیں ، ہونٹوں کے کنول کھلے ہوئے تھے، چہرے پر کیسی شادابی تھی مگر آج وہ کس قدر بجھ گئی ہے۔‘‘

(افسانہ’’ٹوٹتے رشتے‘‘ڈاکٹر قمر جہاں)

نصرت آرا نے اپنے افسانوں میں عورت مرد کے ازلی اور اٹوٹ رشتے کو دکھانے کی کوشش کی ہے۔کم عمری کی شادی اور اس کا خوفناک انجام، جہیز کے مسئلہ اور اسی طرح کی دوسری پریشانیوں کا ذکر ان کے افسانوں میں ملتا ہے۔ ازدواجی رشتے کو خوشگوار بنانے کی وہ کوشش کرتی رہی ہیں۔ جہیز کے خلاف سماجی طور پر بھی آواز اٹھائی جارہی ہے لیکن اس کا کوئی خاص فائدہ دکھائی نہیں دیتا ہے۔ یہ نہ صرف لڑکیوں کے ماں باپ کے لیے بلکہ لڑکیوں کے لیے بھی ایک ناسور بن کر رہ گیا ہے۔

ڈاکٹر شمیم افزا قمر نے عورت مرد کے تعلقات کے ساتھ ساتھ گھریلو جھگڑے اور شکوہ شکایات کو اپنے افسانوں میں بہت فنکاری سے پیش کیا ہے۔ وہ عورتوں کی زبان میں افسانے لکھتی ہیں۔

صبوحی طارق نے عورتوں اور لڑکیوں کے مسائل اور گھروں میں ہونے والے آئے دن کے چھوٹے بڑے واقعات کو اپنے افسانوں میں فنکاری کے ساتھ پیش کیا ہے۔عورت ہونے کے ناطے وہ عورتوں کے جذبات سے اچھی طرف واقف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ لڑکیوں اور عورتوں کا نفسیاتی تجزیہ کرنے میں پوری طرح کامیاب ہیں۔

نشاط افزا جوان لڑکیوں کے ادھورے خواب، ان کا ذہنی انتشار اور پڑھی لکھی برسر روزگار عورتوں کی دفتر اور گھریلو الجھنوں کو بھی اپنے افسانے کا موضوع بنایا ہے۔انھوں نے ایسی جوان لڑکیوں کی اصلاح کرنے کی کوشش کی ہے جو عشق ومحبت کی حسین داستانوں کو حقیقی شکل دینے کی کوشش میں بربادی کی کھائی میں گرتی جارہی ہیں۔

ڈاکٹر اشرف جہاں نے اپنے افسانوں میں عورتوں کی معاشرتی زندگی اور ان کے استحصال کو قارئین کے سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ وہ درس وتدریس سے جڑی تھیں اس لیے اپنی مشاہداتی قوت اور فنکارانہ صلاحیت کو بروئے کار لاکر عورت ذات کی شناخت قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔

شائستہ انجم نوری نے کم ہی افسانے لکھے ہیں لیکن ان کے افسانوں میں عورتوں کے مسائل کو اٹھایا گیا ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں عام طور پر مرکزی کردار کی شکل میں عورتوں ہی کو پیش کیا ہے۔کہیں وہ عورت کی عظمت وتقدس اور کہیں اس کی عزت و ناموس کی اہمیت پر زور دیتی ہیں تو کہیں کہیں عورتوں کی کمزوری کا بھی ذکر انھوں نے کیا ہے۔

ان کے علاوہ بہار کی خواتین افسانہ نگاروں میں عصمت آرا ، شمیم صادقہ ، کہکشاں پروین، نسرین ترنم ،شگفتہ عارف ،تسنیم کوثر ، تبسم فاطمہ، امروز جہاں ،شہناز فاطمی، آشا پربھات ،غزالہ قمر اعجاز ، نصرت آرا، کہکشاں توحید، افسانہ خاتون، ڈاکٹر فرزانہ اسلم، نسرین بانو اور ناہید اختر وغیرہ نے اپنے افسانوں میں خواتین کے مختلف مسائل کی طرف توجہ دی ہے۔

❑❑❑

Dr. Shaika Afrin
Govt. Urdu Middle School Nazra
P.O. Meghwan, Via : Benipatti
Dist: Madhubani - 847102 (Bihar)

نور شاہ کی افسانہ نگاری

حقیقت اور رومان کا سنگم

صبی جی

وادیٔ کشمیر ابتدا سے ہی علم وفن، تہذیب وتمدن اور فکر وفلسفہ کا مرکز رہی ہے۔ علم، ادب، فنونِ لطیفہ، موسیقی، دستکاری یا فلسفہ، کوئی ایسا میدان نہیں جس میں کشمیریوں نے اپنی صلاحیتوں کا لوہا نہ منوایا ہو۔ اردو زبان وادب کی تاریخ میں بھی اہلِ کشمیر کی تخلیقی خدمات نمایاں مقام رکھتی ہیں۔

اردو افسانہ نگاری برصغیر کی نہایت مشہور ومقبول اور اہم نثری صنف ہے۔ اس صنف کی آبیاری جہاں پریم چند، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، کرشن چندر، قرۃ العین حیدر وغیرہ جیسے عظیم افسانہ نگاروں نے کی، وہیں کشمیر کے افسانہ نگاروں نے بھی اس صنف کو عروج تک پہنچانے میں قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔ کشمیر کے جن افسانہ نگاروں نے اس صنف کو وقار بخشا ان میں 'نور شاہ' کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ نور شاہ گزشتہ چھ دہائیوں سے افسانوی ادب کی خدمت کرتے آرہے ہیں اور ان برسوں کے دوران وہ نہ صرف افسانوی ادب میں آنے والی تبدیلیوں کے شاہد رہے بلکہ اپنے قلم کے ذریعے بدلتے ہوئے حالات کو بھی افسانوی انداز میں پیش کرتے رہے اور معاشرے کو اس کا حقیقی چہرہ دکھاتے رہے۔

کشمیر میں اردو افسانے کی تاریخ میں جہاں پریم ناتھ پردیسی کا نام سنہری حروف میں درج ہے، وہیں نور شاہ بھی ایک معتبر اور نمایاں افسانہ نگار کے طور پر پہچانے جاتے ہیں۔ انھوں نے افسانہ نگاری، ناول نگاری، ڈراما نگاری، خاکہ نگاری، کالم نویسی، تنقید وتحقیق وغیرہ جیسی اصناف میں نمایاں کارنامے انجام دیئے، لیکن اردو ادب میں ان کی پہچان بحیثیت افسانہ نگار کے طور پر ہی کی جاتی ہے۔

نور شاہ نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز 22 سال کی عمر میں کہانی 'دلنی' لکھ کر کیا۔ ان کے اب تک ایک درجن سے زائد افسانوی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں جن میں بے گھاٹ کی ناؤ، ویرانے کے پھول، ایک رات کی ملکہ، من کا آنگن اداس اداس، گیلے پتھروں کی مہک، بے ثمر سچ، آسمان پھول اور لہو، کشمیر کہانی، کیسا ہے یہ جنوں، سوکھی ندی کا گیت، پتھر اور انسان، ایک معمولی آدمی اور ایک لمبی عمر کی تنہائی جیسے افسانوی مجموعے شامل ہیں۔

نور شاہ کے افسانے حقیقت اور رومان کا ایک حسین سنگم ہے۔ یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ دنیا میں کوئی بھی ادب اپنے ماحول سے الگ یا لاتعلق نہیں ہوسکتا۔ ہر ادیب، مصنف اور شاعر براہِ راست یا بالواسطہ، شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے گرد وپیش کے ماحول سے اثر قبول کرتا ہے۔ جیسے کہ نور شاہ نے کشمیر کے ایسے علاقے میں پرورش پائی ہے جو ڈل جھیل کے کنارے واقع ہے اور اس علاقے کے دلکش نظاروں نے ان کے اندر جو جمالیاتی شعور پیدا کیا وہ ان کے افسانوں میں جا بجا دیکھنے کو ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ابتدائی افسانوں میں زیادہ تر رومانوی کہانیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ چنانچہ نور شاہ خود اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مجھے اعتراف کرنے میں کوئی تامل نہیں کہ میرے افسانوں

کے اکثر و بیشتر کردار رومانوی ہیں میرا ماننا ہے کہ زندگی کے دھارے رومان کے چشموں سے پھوٹتے ہیں میرا ایسا سوچنا بجا بھی ہے کہ زندگی حُسن و عشق سے عبارت ہے اور نسل آدم کی بقا ان ہی سے قائم ہے چنانچہ خوبصورت منظر، جلوہ سامانیاں اور ڈھلے ڈھلائے کردار غیر اختیاری طور پر قلم کی نوک میں چھپے کیمرے میں قید ہو جاتے ہیں اور تخیل کی آنکھ دیر تک انھیں دیکھتی رہتی ہے۔ دراصل وادی کے جس حصے میں، میں نے اپنا بچپن اور لڑکپن گزارا ہے اور جوانی کے ایام جیے ہیں وہ ڈل جھیل کے آس پاس کے کچھ حصے ہیں یہ وہ جگہ ہے جہاں پہاڑ، پانی اور سبزہ بیک وقت نظر آتا ہے کہنا یہ ہے کہ وادی کے اسی حصے میں میرے احساسِ جمال کی پرورش ہوئی ہے اور وہ حسن جو میری آنکھوں نے سمیٹ لیا ہے لاشعوری طور پر میری کہانیوں میں منعکس ہوتا ہے۔“[1]

نور شاہ کے افسانوں میں جمالیاتی احساس کی جڑیں کشمیر کی دلکش وادیوں اور پرکشش مناظر میں پیوست نظر آتی ہیں۔ اُن کی تخلیقات میں جگہ جگہ کشمیر کی فطری خوبصورتی جھلکتی ہے۔ وہ اپنے افسانوں میں وادی کے دلفریب نظاروں، سبزہ زاروں، باغوں، جھیلوں، ندیوں، شفاف جھرنوں اور برف سے ڈھکے پہاڑوں کے دل موہ لینے والے مناظر کا ذکر بڑے سلیقے سے کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ کشمیر کے روح پرور مقامات جیسے گلمرگ، سون مرگ، پہلگام وغیرہ کا بھی نہایت دلکش انداز میں تذکرہ کرتے ہیں، جو اُن کے فن میں ایک مخصوص کشمیری رنگ اور جمالیاتی لطافت پیدا کرتا ہے۔ انھوں نے اپنے افسانے ”اندھیرے اُجالے“ میں کشمیر کی خوبصورتی کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچا ہے:

”کشمیر کی ہر چیز قابلِ تعریف ہے ہری بھری شاداب وادی، سندر دھرتی، بھانت بھانت کے لوگ، پہاڑ جن کی گود میں ہرے بھرے جنگل ہیں جو آگے آگے پھیل کر ایسی شکھر مالاؤں میں بدل جاتے ہیں جہاں بارہ مہینے برف کا راج رہتا ہے۔ یہاں کے بہتے ہوئے پانی کا رنگ نیلا ہے، سبز ہے یہاں پھولوں سے جڑی ہوئی مرگیں ہیں، رنگ برنگے پھولوں سے سجے سنورے تختے ہیں جنگلی خوشبو میں سیاحوں اور یاتریوں کی سانسیں رچی بسی ہیں۔ یہ گلمرگ، یوس مرگ، پہلگام، یہ شالیمار ہے، یہ نشاط ہے، نور جہاں کے خوابوں کا باغ، جہانگیر کی جوانی کی یادگار، یہ ڈل جھیل ہے، اس پر چلتی پھرتی ننھی ننھی کشتیاں اور دلہن کی طرح سجے سنورے ہاؤس بوٹ۔ یہ لدر نالہ ہے جس کا پانی پتھروں سے سر پھوڑتا جھاگ بناتا ہوا جاتا ہے۔ یہ کل کل کرتی ندیاں اور ان کے کنارے بید کے پیڑوں کی قطاریں چنار کے پتوں کا لال رنگ کھیتوں میں پکے ہوئے اناج کی سرخ بالیاں۔ یہ کشمیر ہے جس کی ہر شئے خوبصورت ہے اور کرسٹینا کی بات سن کر مجھے پہلی بار محسوس ہوا کہ اس خوبصورتی میں اضافہ کرتے ہیں سفیدے کے لمبے لمبے پیڑ۔!“[2]

نور شاہ کے افسانوں کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ تاثر ابھرتا ہے کہ وہ قاری کو ایک نہایت نرم، حسین اور رومانویت سے لبریز فضا میں لے جاتے ہیں، جہاں جذبات اور احساسات کی لطافت چھائی ہوتی ہے۔ ان کی تحریر قاری کو ایک ایسے جمالیاتی اور تخیلاتی ماحول میں ڈبو دیتی ہے جو دل و دماغ دونوں کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ان کے ہاں حسن کا تصور صرف ظاہری جمال تک محدود نہیں بلکہ اُس میں گہرائی، معنویت اور تخلیقی بصیرت بھی شامل ہے۔ اُن کی تحریروں میں حسن پسندی اور حسن پرستی ایک تخلیقی قوت کے طور پر ظاہر ہوتی ہے جو انسانی فطرت، احساس اور شعور کی گہرائیوں کو اُجاگر کرتی ہے۔

دراصل حسن ایک ایسی کیفیت کا نام ہے جس سے کوئی بھی انسان متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا اور نور شاہ کے یہاں اس کا اظہار بھر پور انداز میں ملتا ہے۔ یہاں تک کہ یہ حسن ان کے فن کا حوالہ بن کر شہ پاروں کی شکل میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ مثلاً افسانہ بے معنی سفر، رات کا سورج، مونا لِزا، صلیب، دروازے وغیرہ اسی طرح کے افسانوں کی مثالیں ہیں۔

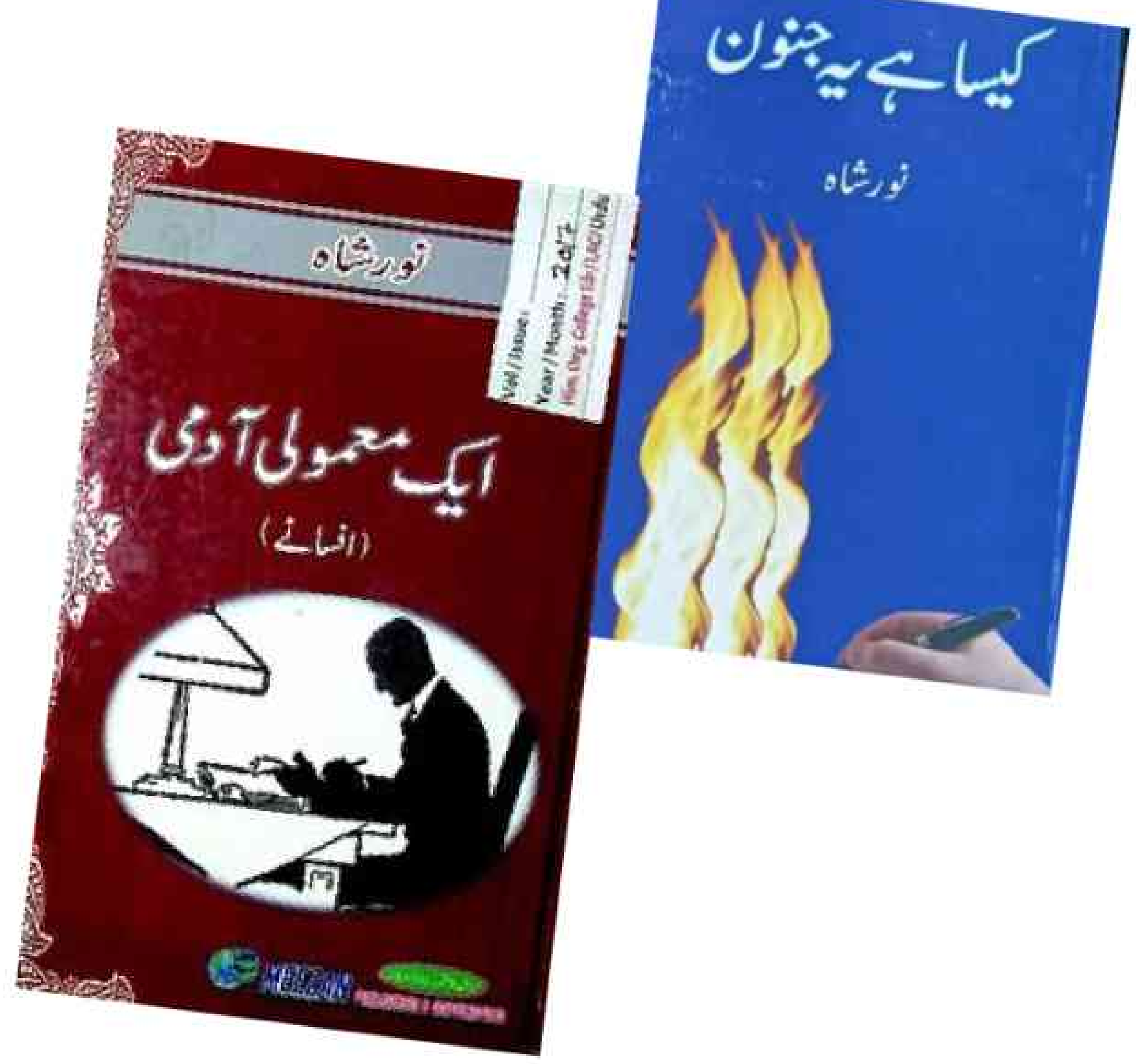

اگرچہ ان کے افسانوں میں رومانوی رنگ جھلکتا ہے لیکن انھوں نے اپنے افسانوں میں رومانی جذبات واحساسات کے ساتھ ساتھ سیاسی وسماجی مسائل کو بھی موضوع بنایا ہے۔ان مسائل کو وہ کہیں کھلم کھلا تو کہیں اشاروں اور علامتوں کے ذریعے ظاہر کرتے ہیں۔حالانکہ کہانی کی ابتدا میں قاری ایک حسین اور رومانوی دنیا میں چلا جاتا ہے، تاہم جیسے جیسے کہانی آگے بڑھتی ہے تو مصنف اسی حسین اور رومانویت کے پردے میں زندگی کی کڑوی حقیقتوں اور مرد و عورت کے باہمی تعلقات کی نفسیاتی پیچیدگیوں کو بڑے فنکارانہ انداز میں آشکار کرتے ہیں۔ یوں قاری کو نہ صرف جمالیاتی لذت حاصل ہوتی ہے بلکہ انسانی زندگی اور نفسیات کی پیچیدہ حقیقتوں کا شعور بھی حاصل ہوتا ہے۔ چناچہ ان کی کہانیوں کا جب غور سے مطالعہ کیا جائے تو واضح ہوجاتا ہے کہ انھوں نے اپنے افسانوں کے ذریعے سماج کی تلخ حقیقت کو بے نقاب کرنے کی کامیاب سعی کی ہے۔ڈاکٹر شمع افروز زیدی نور شاہ کی کہانیوں کے متعلق لکھتی ہیں:

’’نور شاہ کی کہانیوں کو جستہ جستہ پڑھیے تو محسوس ہوتا ہے کہ ان کے یہاں ورائٹی اور تنوع ہے۔وہ اپنی کہانیوں میں زندگی کے تلخ حقائق،نفسیاتی کشمکش، حالات اور ماحول کا المیہ اس خوبی سے سموتے ہیں کہ قاری کے ذہن ودل پر کاری ضرب لگتی ہے۔لیکن اس کاری ضرب کو سنبھالنے کے ہنر سے بھی واقف ہیں۔اس لیے قاری کو لطیف رومانی ماحول بھی فراہم کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور حسن کا ذکر اس دلکش پیرائے میں کرتے ہیں کہ قاری کے ذہن سے دکھوں کے بادل چھٹ جاتے ہیں۔اور یہی خوبی انھیں امتیاز بخشتی ہے۔‘‘[3]

کوئی بھی قلمکار اپنے اردگرد پیش آنے والے حالات، واقعات اور حادثات سے بے پرواہ نہیں رہ سکتا۔ چناچہ وہ جس طبقے سے وابستہ ہوتا ہے اسی طبقے کے حق میں آواز اٹھاتا ہے۔ جیسے جنسی استحصال اور ہوس موجودہ معاشرے کے سنگین مسائل ہیں، تو نور شاہ نے اپنی کہانیوں کے ذریعے ان مسائل کو عوام تک پہنچانے کی سنجیدہ کوشش کی ہے۔افسانہ ’’درندے‘‘ میں انھوں نے ایک ایسے ہی مسئلے پر قلم اٹھایا ہے جس سے سماج کا وحشیانہ چہرہ سامنے آجاتا ہے۔اس افسانے میں حقیقت اور رومانیت دونوں یکجا نظر آتے ہیں۔ افسانے کی شروعات تو رومانی مناظر سے ہوتی ہے لیکن اختتام ایک خوفناک اور وحشیانہ منظر پر ہوتا ہے۔نور شاہ نے اس افسانے کو نہایت حسین اور دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔اس میں دو محبت کرنے والے دلوں کی داستان بیان کی گئی ہے، جو ایک ساتھ زندگی گزارنے کے بے شمار وعدے اور قسمیں کھا چکے تھے اور اپنے عشق کے اقرار نامے پر مہر بھی ثبت کر چکے تھے۔ مگر ایک دن جب مادوی اس لڑکے (جس سے وہ شادی کرنا چاہتی تھی) کو لینے کے لیے ائیر پورٹ کی طرف جا رہی تھی تو راستے میں کچھ درندوں نے اسے اغوا کر کے اس کی عزت کو پامال کیا اور اسے شدید زخمی حالت میں لہولہان کر کے برہنہ و نیم جان حالت میں سنسان سڑک پر پھینک دیا، اور آخر کار مادوی نے اسپتال میں اپنا دم توڑ دیا۔ پیش ہے اس افسانے سے چند اقتباس:

’’جس روز میں لندن سے اپنے شہر لوٹنے والا تھا میں نے اپنے آنے کی اطلاع صرف مادوی کو دی اور مادوی نے مجھے فون پر بات کرتے ہوئے کہا،’’میں تمہیں کیسے بتاؤں کہ آج میں کس قدر خوش ہوں، جی کرتا ہے کہ آسمان کے تارے نوچ لوں اور تمہارے قدموں پر ڈال دوں، میں تمہیں خود لینے آؤں گی، ائیر پورٹ پر تمہارا انتظار کروں گی۔

اور جب میں ایرپورٹ پہنچا تو کسی کو بھی اپنا منتظر نہیں پایا، مادوی کو بھی نہیں۔ میرا دل ٹوٹ گیا، میری آنکھوں کے کونے بے ساختہ بھیگ گئے۔ ایک ہوک سی اٹھی، میرا سارا وجود جیسے دھواں دھواں ہوگیا اور میں ٹوٹتے ہوئے قدموں سے ایرپورٹ سے باہر آیا، سیدھا مادوی کے گھر گیا میں یہ جان کر حیران رہ گیا کہ مادوی تو صبح سویرے ہی ایرپورٹ جانے کے لیے گھر سے نکلی تھی مجھ سے ملنے کے لیے۔ پہلے ہم نے مادوی کے دوستوں کو فون کئے اور اس کے بعد مادوی کے کالج جا کر پوچھ تاچھ کی لیکن ہر جانب جیسے خاموشی کے اندھیروں نے حصار کھینچ لیے تھے جیسے سب نے چُپ رہنے کی قسم کھائی تھی۔ اور پھر ہم نے مادوی کی گمشدگی کی اطلاع پولیس تک پہنچا دی۔

اور اب میں کیسے بتاؤں، مادوی ہاسپٹل کے ایک خاموش کمرے میں زندگی اور موت کے دوراہے پر کھڑی بار بار میرا نام لے رہی تھی۔

’’میں تمھیں مرنے نہیں دوں گا، میں تمہیں موت کے بے رحم ہاتھوں سے چھین لوں گا تم جیو گی میرے لیے اپنے ہونے والے بچوں کے لیے ان خوابوں میں رنگ بھرنے کے لیے جو ہم نے ایک ساتھ دیکھے تھے!‘‘

لیکن مادوی نے میرا انتظار نہیں کیا، میری بات تک بھی نہ سنی، جب میں نے ہاسپٹل کے کمرے میں قدم رکھا تو مادوی میرا نام لیتے لیتے سو چکی تھی، ہمیشہ کے لیے اور پولیس مرنے سے پہلے اس کا بیان بھی لے چکی تھی اور اب وہ ان درندوں کی تلاش کر رہی تھی جنھوں نے مادوی کو ایرپورٹ جاتے ہوئے اغوا کر لیا تھا اور اُس کی آبروریزی کر کے لہولہان کیا تھا اور پھر اُسے زخمی اور برہنہ حالت میں بجھی بجھی سی سانسوں کے ساتھ شہر سے دور ایک ویران سڑک پر پھینک دیا تھا!‘‘[4]

بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں کشمیر میں برپا ہونے والے انقلاب نے اس سرزمین کی حالت یکسر بدل دی۔ یہاں کے حالات جب بگڑنے لگے تو وادی جو کبھی جنت بے نظیر کہلاتی تھی، آہستہ آہستہ ایک دہکتے جہنم میں تبدیل ہوگئی۔ انھیں بدلتے حالات کے ساتھ نورشاہ کی کہانیوں کا لہجہ اور موضوعات بھی بدل گئے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی کہانیوں میں کشمیر کے بدلتے حالات، یہاں کی ویرانیاں، جہلم اور ولر کے سرخ ہوتے پانی اور کشمیری مظلوم عوام کی زندگی، ان کے درد وکرب، ان کے رنج وغم، ان کے ذہنی انتشار، ان کے جذبات و احساسات، ان کی خواہشات وغیرہ کو جابجا پیش کر کے اپنی قومی ہمدردی کا ثبوت پیش کیا۔ ’’پروفیسر قدوس جاوید‘‘ نورشاہ کی حقیقت پسند افسانہ نگاری کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ’’چنانچہ جب کشمیر کے مقدر میں ویرانیوں کی دراندازی ہوئی جہلم اور ولر کے پانی کا رنگ سرخ ہوا اور فضاؤں میں سیبوں اور ناشپاتیوں کی خوشبوؤں کی جگہ بارود کی بو نے گھیر لی تو زندگی کی طرح ادب کے تخلیقی اور فکری سروکاروں اور اظہاری رویّوں میں بھی تبدیلیاں رونماں ہوئیں جس کے سبب رومانیت اور تصوریت کے دلدادہ نورشاہ کا فن بھی گرینیڈ دھماکوں، قتل وخوں، آبروریزی اور عدم تحفظ کے زائیدہ کشمیر کے نئے ڈسکورس کے حوالے سے بیانیہ (Narration) کے ایک نئے سانچے میں ڈھل گیا اسے حقیقت پسندانہ سماجی وثقافتی بیانیہ (Realistic Socio-Cultural Narration) کہہ سکتے ہیں لیکن اس کے باوجود نورشاہ کے ایسے افسانے صحافتی رپورٹنگ یا بے روح مرقعے نہیں ہیں۔ ان میں وہ فنی و جمالیاتی عناصر موجود ہیں جو افسانہ کو افسانہ بناتے ہیں البتہ انھیں اگر ’’ٹریجڈی کی جمالیات‘‘ کا نام دیا جائے تب بھی نور شاہ کے ایسے افسانویت پر حرف نہیں آئے گا۔‘‘[5]

نورشاہ نے اس نوعیت کے بہت سارے افسانے تخلیق کیے ہیں جن میں کشمیر کے بدلتے حالات کو بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ مثلاً خواب بھی بکتے ہیں، کرب ریزے، سوداگر، کوئی رونے والا نہیں،

دلِ ویران میں کیا غم، ہیلنگ ٹچ، آسمان پھول اور لہو، یہی سچ ہے، زمیں کھولے گی زباں اپنی، ٹوٹتے لمحوں کا بیان، لکیریں، وہ ایک شخص تھا، وغیرہ جیسے افسانے اس کی مثالیں ہیں۔پیش ہے افسانہ ''خواب بھی بکتے ہیں'' میں کشمیر کی ایک ہلکی سی تصویر:

''کب آئے گا میرا بیٹا مولوی صاحب''

''انتظار کرو علی خان۔۔۔آنے سے پہلے وہ تمھیں ضرور چٹھی لکھے گا''

اور اس دن کے بعد وہ اپنے بیٹے کی چٹھی کا انتظار کرنے لگا!! پانچ سال کا طویل عرصہ۔۔۔اس دوران یہ جنت دھیرے دھیرے، آہستہ آہستہ، رُک رُک کر ایک نیا روپ اختیار کرتی گئی۔۔۔جہنم کا روپ۔آگ، شعلے، قتل وغارت ، آبرو ریزی، ناانصافی ۔اور پھر ایک عجیب سی بات ہوئی، لگاتار بہت سے نوجوان لاپتہ ہوگئے، بسیار تلاش کے بعد بھی اُن کے بارے میں کوئی جانکاری نہ ملی، پھر ایک ہنگامہ ہوا، لوگ متحرک ہوگئے اور حراستی ہلاکتوں کے خلاف سڑکوں پر آ گئے، تلاش شروع ہوئی، کئی بے نام قبروں کی نشاندہی کی گئی اور کئی مسخ شدہ بے نام لاشیں اُن قبروں سے برآمد کی گئیں۔۔۔![6]

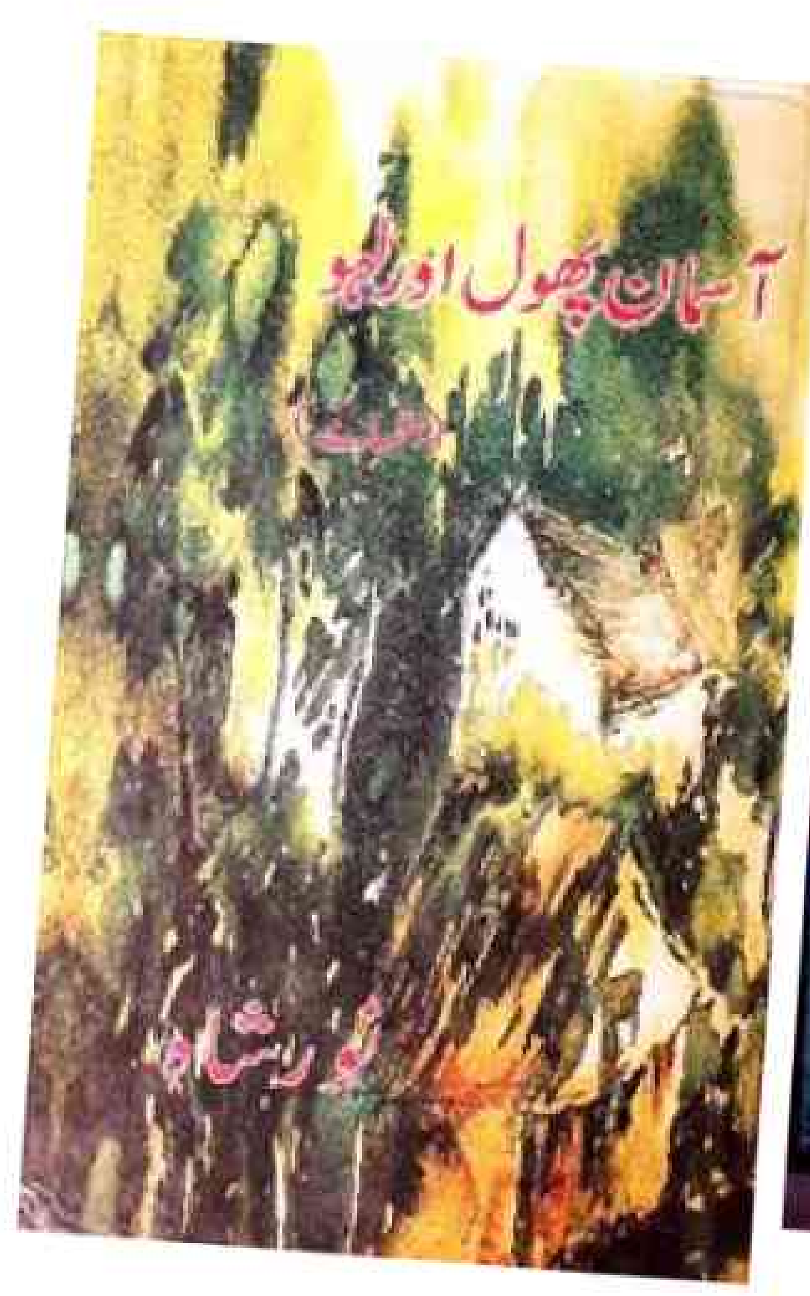

نورشاہ کے افسانوں میں زبان و بیان کی دلکشی، منظر نگاری کی قوت اور جذبات کی گہرائی مل کر اُن کے فن کو ایک انوکھا حسن عطا کرتی ہے۔وہ اپنی کہانیوں کی فضا کو اپنی دلکش زبان، نفیس اسلوب اور تخلیقی اظہار کی خوشبو سے معطر کر دیتے ہیں۔ان کی نثر میں ایک خاص شگفتگی، روانی اور شعری لطافت پائی جاتی ہے جو ان کے افسانوں کو ایک منفرد جمالیاتی رنگ عطا کرتی ہے۔وہ الفاظ کے ایسے گلزار سجاتے ہیں جو قاری کے ذہن میں زعفران زار کی طرح خوشبو بکھیر دیتے ہیں۔

نور شاہ کے افسانوں کی فضا ایک ساتھ حقیقت پسندی اور رومانیت کے امتزاج سے تشکیل پاتی ہے، جس میں زندگی کے تلخ و شیریں پہلو بڑی مہارت سے یکجا کیے گئے ہیں۔ان کے قلم کی جادوگری مختلف رنگوں میں جلوہ گر ہوتی ہے۔کہیں وہ نرمی اور لطافت سے بھرپور مناظر تخلیق کرتے ہیں، کہیں جذبات کی شدت اور شعلہ بیانی سے قاری کو جھنجھوڑتے ہیں، اور کہیں وہ آئینہ خانوں کی مانند ایسی تخلیقی دنیا آباد کرتے ہیں جہاں انسانی احساسات کے رنگ جھلملاتے ہیں۔غرض وہ جنس کو عام زندگی سے الگ نہیں کرتے بلکہ اس کے پسِ پردہ زندگی کی ناہمواریوں پر روشنی ڈالتے ہیں اور سماج کے حقائق قاری کے سامنے عیاں کر دیتے ہیں۔

حواشی:

1 بے ثمر سچ، نورشاہ، امیکس بکس، این۔آئے۔ٹی روڑ، حضرت بل سرینگر کشمیر، 2005، ص 8

2 ایضاً، ص 79-80

3 کیسا ہے یہ جنون، نورشاہ، الفجر پرنٹرس، سرینگر کشمیر 2015، ص 21

4 ایضاً، ص 55

5 ایضاً، ص 10

6 آسمان پھول اور لہو، نورشاہ، ساغر کمپیوٹرس سرینگر کشمیر، 2009، ص 92

Sabi Ji
Research Scholar
Department of Urdu
Begum Azeezun Nisa Hall
Block Ist, (Room No 47)
Aligarh Muslim University
Aligarh-202002 (U.P)
Email: sabiji001@gmail.com

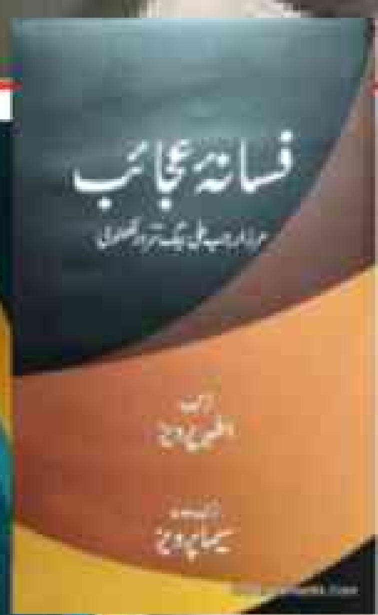

اطہر پرویز کے شخصی خاکوں کا تنقیدی مطالعہ

نگہت

شعبہ اردو کے استاد اور ادیب اطہر پرویز کا اصل نام محمد عثمان تھا۔ ان کی پیدائش (1924) میں الہ آباد میں ہوئی۔ انھوں نے اپنی ابتدائی تعلیم سے لے کر انٹر تک کی تعلیم الہ آباد میں حاصل کی اور اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ آ گئے۔ انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی۔اے، ایم۔اے (فارسی) ایم۔اے (اردو) کی ڈگریاں حاصل کیں۔ تعلیم مکمل ہو جانے کے بعد اپنے وطن منڈلہ الہ آباد چلے گئے اور ہندوستان کی آزادی کے لیے کام کرتے رہے۔ مکتبہ جامعہ دہلی میں کچھ دنوں کام کرنے کے بعد (1958) میں ڈاکٹر ذاکر حسین کے مشورے سے علی گڑھ آ گئے۔ ان دنوں کرنل بشیر حسین زیدی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ یہاں اطہر پرویز کا تقرر (1958) میں جنرل ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ میں بطور لیکچر رہوا۔

اس کے بعد ان کو (1959) میں شعبہ اردو میں منتقل کر دیا گیا۔ وہ شعبہ اردو میں استاد کی حیثیت سے اردو زبان و ادب اور داستان کا پرچہ پڑھاتے تھے۔ راقم الحروف کا مقصد مصنف کی سوانح بیان کرنا نہیں ہے بلکہ ان کی فنی، فکری اور ادبی کارناموں پر روشنی ڈالنا ہے۔ انھوں نے معروف اور غیر معروف ہستیوں کے خاکے نما مضامین لکھے جو کتابی شکل میں ''چہرہ بہ چہرہ روبرو،، کے عنوان سے منظر عام پر آئے۔ ان خاکوں میں ان کا بچپن ہو یا طالب علمی کا زمانہ یا بعد کی زندگی کے مختلف ادوار، سب کی جھلکیاں ملتی ہیں۔

اطہر پرویز کی کتابوں میں 'ادب کا مطالعہ'، 'علی گڑھ سے علی گڑھ تک'، اور ان کی مرتب 'فسانہ عجائب'، بہت مقبول ہوئیں۔ کتاب ''داستان کا فن،، ان کی پی ایچ۔ڈی کا مقالہ ہے جو ان کے انتقال کے بعد کتابی شکل میں شائع ہوئی۔ انھوں نے بچوں کے لیے بھی کتابیں لکھیں جو بہت پسند کی گئیں اور ان پر انعامات بھی ملے۔ 'علی گڑھ سے علی گڑھ تک'، ان کی بہترین کتاب ہے جسے ادبی حلقوں میں پسند کیا گیا۔ اس کتاب کی مقبولیت آج بھی قائم ہے۔ کتاب میں علی گڑھ، شمشاد مارکیٹ اور اس دور کے وائس چانسلرس، اساتذہ، دوست احباب وغیرہ کا ذکر تفصیل سے ملتا ہے۔ 10 مارچ (1984) کو شام سات بجے اردو ادب کا یہ ادیب اس دنیا سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا۔ ان کے لکھے خاکوں کی کتاب ''چہرہ بہ چہرہ رو بہ رو،، پر اپنا اظہار خیال کرتے ہوئے پروفیسر ابوالکلام قاسمی رقم طراز ہیں:

> ''چہرہ بہ چہرہ رو بہ رو،، بھی کم و بیش اسی نوعیت کی کتاب ہے جس میں الہ آباد، دہلی، اور علی گڑھ کے علاوہ قید و بند کی زندگی کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ اس کتاب میں شامل مضامین کو خاکہ نگاری کا نام بھی دیا جا سکتا ہے اور اسے یادوں کی بازیافت بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ خاکوں کے ضمن میں قدسیہ زیدی، نواب چھتاری، رشید احمد صدیقی اور جامعہ ملیہ کے ایک ڈرائیور کی شخصیت اور عادات و اطوار کا ایسا نقشہ کھینچا گیا ہے کہ ضرب المثل ثابت آتا ہے'' [1]

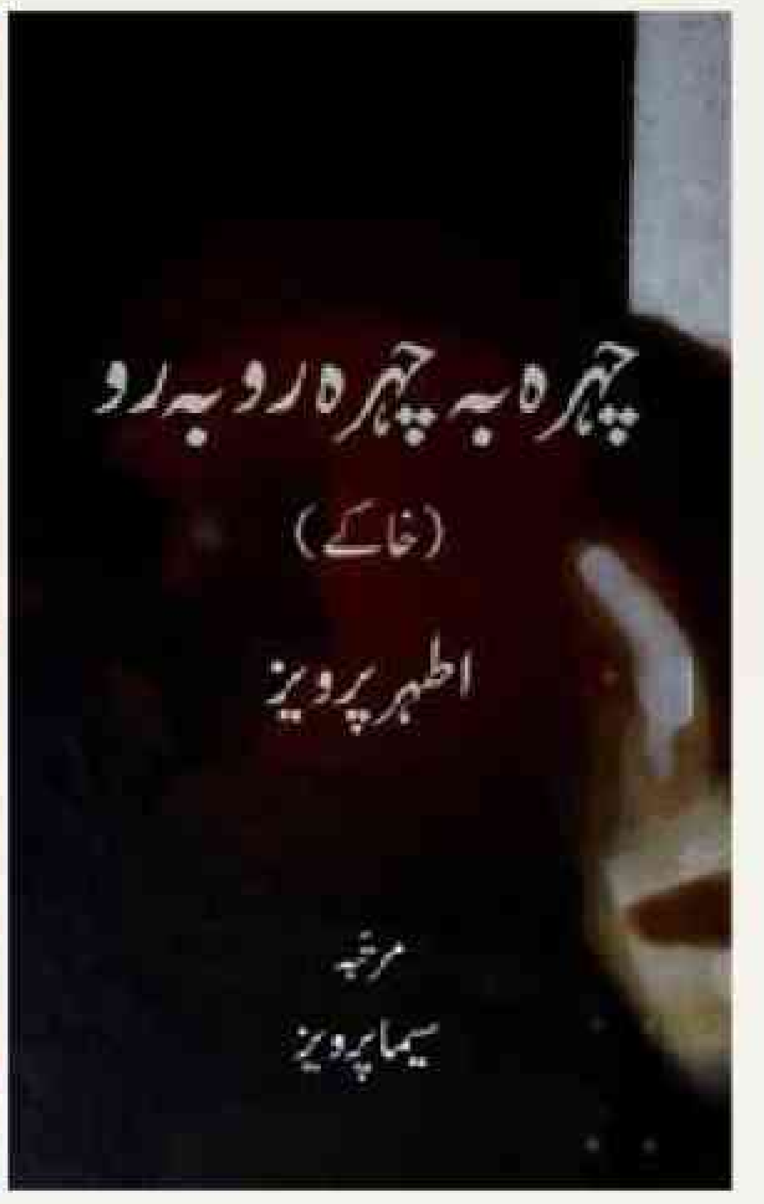

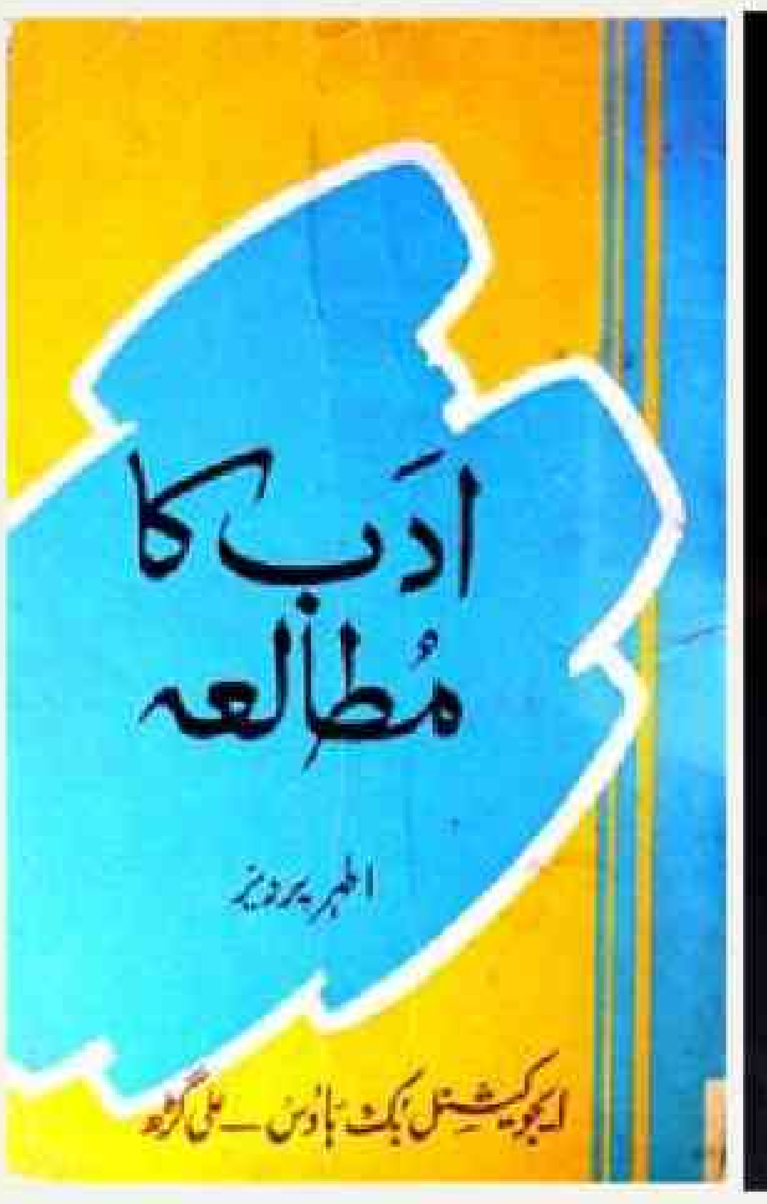

'چہرہ بہ چہرہ رو بہ رو' کے عنوان سے یہ کتاب ان کے انتقال کے تقریباً 41 سال بعد ان کی بیٹی سیما پرویز نے مرتب کر کے شائع کی ۔ اس میں لکھے ہوئے خاکے کچھ اس طرح ہیں ۔ ادیبوں کی آپ بیتی ، ایک پل جو ٹوٹ گیا ، ایک رہنما ایک انسان سر عبدالرزاق محمد ، جانکی اماں ، شوکت علی خاں ، چھتاری ، رشید احمد صدیقی ، ایک بستی ایک تہذیب ، قدسیہ آپا ، پوچھتے ہیں وہ کہ ، وغیرہ ہیں ۔

اس کتاب میں کچھ خاکے بہت ہی دلچسپ ہیں ۔ ان پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے ۔ ویسے تو سبھی خاکے انفرادی اہمیت کے حامل ہیں ۔ ادیبوں کی آپ بیتی کے عنوان سے جو خاکہ ہے اس میں انھوں نے جیل میں گزارے ہوئے لمحوں کو قلم بند کیا ہے ۔ جیل میں قیام کے دوران اُن کی ملاقات کئی لوگوں سے ہوئی ، ان میں سردار جی اور شنکر اہمیت کے حامل ہیں ۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہندوستان آزاد نہیں ہوا تھا ۔ انھیں کمیونسٹ پارٹی سے تعلق رکھنے کی وجہ سے گرفتار کر لیا گیا ۔ جیل کے قیام کے دوران اطہر پرویز کی ملاقات دوسرے سیاسی قیدیوں سے بھی ہوئی ۔ انھوں نے بڑی خوش دلی سے ان کا استقبال کیا ۔ جیل کئی اعتبار سے بڑی اچھی جگہ ہے ، یہاں لوگ ایک دوسرے کو انسان کی حیثیت سے دیکھتے اور احترام کرتے ہیں ۔

اس کتاب کا دوسرا خاکہ 'ایک پل جو ٹوٹ گیا' ، کے عنوان سے ہے ۔ اس خاکے میں انھوں نے گاندھی وادی محمود احمد ہنر کی طرز زندگی سے متعارف کرایا ہے ۔ وہ اپنے وطن الہ آباد کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''الہ آباد گنگا اور جمنا کا سنگم ہے ۔ یہ دریاؤں کا نہیں تہذیبوں کا سنگم بھی ہے ۔ یہاں ہندو مسلمان مل جل کر رہتے ہیں ۔ یہاں اردو اور ہندی آ کر گلے ملتی ہیں ۔ یہ نرالا اور فراق کا شہر ہے ۔ یہاں اکبر اعظم کا بنایا ہوا قلعہ ہے ۔ جو سنگم کے سامنے اسی آب و تاب سے کھڑا ہے ۔ یہیں اکبرالہ آبادی نے شعروں سے لوگوں کے دلوں کو جیتا ۔ یہ موتی لال نہرو اور جواہر لال کا الہ آباد ہے ۔۔۔ یہ الہ آباد سچ پوچھو تو اللہ کا آباد کیا ہوا شہر ہے ۔''2

''ایک رہنما ایک انسان ، ، اطہر پرویز نے اس خاکے میں موریشس کے ایک رہنما سر عبدالرزاق محمد کی زندگی کے چند پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے ۔ انھوں نے اپنی زندگی اردو زبان کی خدمت کرتے ہوئے گزاری ۔ وہ چاہتے تھے کہ اردو زبان سے محبت کرنے والے اپنی زبان و تہذیب کی بقا کے لیے خود بھی کچھ کریں ۔ اس خاکے کو پڑھ کر ان کی شخصیت ، مزاج ، عادتیں سب کچھ آنکھوں کے سامنے آ جاتے ہیں ۔ سر عبدالرزاق محمد ساری زندگی سیاست سے وابستہ رہے اور ہمیشہ دوسروں کی مدد کرتے رہے ۔ وہ بہت ہی نڈر ، بے باک اور دین دار شخصیت کے مالک تھے ۔

'جانکی اماں' ، اس خاکے میں اطہر پرویز نے الہ آباد میں رہنے والی بیوہ عورت کی تصویر کشی کی ہے ۔ وہ بیوہ ہونے کے بعد بھی ہمت و حوصلہ نہیں کھوتی بلکہ دن رات محنت و مشقت کر کے اپنی زندگی بسر کرتی ہیں ۔ وہ جب تک ہوش و حواس میں رہی نہ کسی کا احسان لیا اور نہ کسی کے آگے ہاتھ پھیلایا ۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہمارا ملک آزاد نہیں ہوا تھا ۔ وہ الہ آباد کے جس محلّے میں رہتی اسے بانس منڈی کہتے تھے ۔ یہ جگہ جمنا کنارے بلوا کھاٹ سے ملی ہوئی تھی ۔ یہاں ہندو اور مسلمانوں کی ملی جلی آبادی تھی ۔ جانکی اماں نے بڑی لمبی عمر پائی ، غدر سے پہلے پیدا ہوئیں اور آزادی کے کئی سال بعد تک حیات رہیں ۔

جانکی اماں اپنی زندگی میں ہٹلر ، رانی وکٹوریہ اور ططّن خاں سے بہت متاثر ہوئیں ۔ انھوں نے کئی نسلوں کو جوان ہوتے ہوئے دیکھا ۔ وہ رفتہ رفتہ بہت بوڑھی اور کمزور ہو گئیں جس کی وجہ سے ان

کی یاد داشت جاتی رہی،تو ان کے گھر والوں نے موقع کا فائدہ اٹھا کر انھیں بھیک مانگنے پر مجبور کر دیا۔ جانکی اماں نے جس اولاد کے لیے پوری زندگی محنت، مزدوری کی وہ آخری عمر میں انھیں دو روٹی نہ دے سکی۔ وہ فرماتے ہیں:

”ایک روز الٰہ آباد سے خط آیا کہ جانکی اماں مرگئیں لیکن میرا خیال ہے کہ وہ مرتو بہت پہلے گئی تھیں۔اس سانحے سے پہلے کہ ان کے عزیزوں نے ان کو سڑک کے کنارے بٹھا دیا تھا۔اس وقت تو محض ان کو دفنانے کی رسم ادا کی گئی۔“3

’شوکت علی خاں‘ اس خاکے میں ایک معمولی حیثیت رکھنے والے ڈرائیور کی زندگی کے حالات کو بیان کیا گیا ہے۔شوکت علی خاں وضع دار، اصول پسند، دیانت دار اور فرض شناس رام پوری پٹھان تھے۔ انھیں ریاست رام پور اور وہاں رہنے والے لوگوں سے بڑی محبت تھی۔ رام پور کی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد وہ دہلی چلے آئے۔ دہلی آنے کے بعد بھی انھیں رام پور سے وہی عقیدت رہی جو رجب علی بیگ کو لکھنؤ سے اور میر تقی میر کو دہلی سے تھی۔

شوکت علی خاں بڑے چھوٹے ہر ایک کو خوش رکھتے۔ان کے یہاں ہنسی اور قہقہے مفت ملتے۔ وہ خاکہ نگاری کا فن خوب جانتے تھے۔ان کے قلم میں بڑی روانی تھی۔ بڑے لوگوں میں تو ایسی بے پناہ خوبیاں ہوسکتی ہیں۔ ان کے بارے میں لکھنا آسان ہے لیکن معمولی ڈرائیور کا خاکہ لکھنا آسان نہ تھا۔

”چھتاری،، کے عنوان سے لکھا گیا یہ خاکہ دراصل چھتاری کے نواب محمد سعید احمد کا ہے۔ چھتاری علی گڑھ سے 20 کلو میٹر کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ آج یہ نام علامت بن گیا ہے۔ اطہر پرویز نے نواب صاحب کی تصویر کو پہلی بار علی گڑھ میگزین میں دیکھا، بڑی بڑی عقابی آنکھیں، رعب دار چہرا، راج پوتوں والی مونچھیں تھیں۔ وہ بہت ہی ہمدرد اور اصول پسند انسان تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کا کوئی دشمن نہ تھا۔ وہ بڑی باتوں کے ساتھ چھوٹی باتوں کا بھی خیال رکھتے۔ وہ عظیم شخصیت کے مالک تھے۔ اپنے بچوں کو نصیحت کرتے ہوئے خط میں لکھتے ہیں:

”اس زمانے میں ہر شخص مختلف قسم کی پریشانیوں میں مبتلا ہے اگر ان پریشانیوں سے نجات دلانے کے لیے حسب ضرورت کسی کی کچھ امداد ہو سکے تو اچھا ہے۔ وقت گزر جاتا ہے لیکن بات باقی رہ جاتی ہے۔“4

نواب صاحب اتنے بڑے آدمی تھے لیکن غرور و تکبر ذرّہ برابر نہ تھا۔ علی گڑھ سے انھیں عقیدت تھی۔ حیدرآباد کی وزارت عظمیٰ سے سبکدوش ہونے کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے۔اس منصب پر آخر وقت تک فائز رہے۔ یہ زندگی کی تلخ حقیقت ہے نہ کسی کے جانے سے دنیا ختم ہوتی ہے اور نہ آنے سے، زندگی اپنی رفتار سے چلتی رہتی ہے بس ایک کمی کا احساس ہوتا ہے۔ نواب چھتاری جیسے لوگ اب کہاں جو خود جل کر دوسروں کو روشنی دیتے ہیں۔

’رشید احمد صدیقی‘ رشید احمد صدیقی سادہ لوح انسان تھے۔ انھیں علی گڑھ سے بے پناہ محبت تھی، علی گڑھ انھیں دل و جان سے عزیز تھا۔ وہ علی گڑھ کے سچے عاشق تھے۔ رشید صاحب کا نام آتے ہی ان کے لکھے ہوئے خاکے، مضامین، انشائیے یاد آنے لگتے ہیں۔ وہ ذرا سی الٹ پھیر سے مزہ پیدا کرنے کا ہنر بخوبی جانتے تھے۔ وہ ممتاز انشا پرداز اور خاکہ نگار تھے۔ رشید صاحب کا نام آتے ہی ہمیں کنڈن یونیورسٹی کا گھنٹہ بجاتا ہوا نظر آتا ہے۔ان کی نثر کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ چند لفظوں میں بڑی سے بڑی بات کہہ دینے کا ہنر جانتے تھے۔

رشید صاحب کی طرز زندگی بہت ہی عام فہم تھی۔ ان کو دیکھ کر مشرقی یوپی کے کسان کی تصویر ابھرتی تھی۔ وہ پیڑ پودوں سے محبت کرتے بلکہ ان کی نگہداشت بھی خود ہی کرتے۔ ان کا پیڑ پودوں اور پھولوں سے رشتہ ایسا ہی تھا جیسا ایک انسان کا دوسرے انسان سے ہوتا ہے۔ ایک دلچسپ واقعہ کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”ایک بار جب وہ اپنے باہر کے باغ میں کھرپی لیے ہوئے اپنے پودوں میں مصروف تھے تو کسی نے ان سے آکر کہا۔

”جاؤ رشید صاحب سے کہہ دو ایک صاحب ملنے آئے ہیں۔،،

رشید صاحب نے کہا۔۔۔”فرمائیے“

وہ بولے۔۔”تم سے کیا فرماؤں تم جا کر پروفیسر صاحب کو

اطلاع دو۔ میں ان سے ملنے آیا ہوں۔تم اپنا کام کرو۔‘‘5

علی گڑھ مسلم یو نیورسٹی کبھی خالی مدرسہ نہیں رہی بلکہ ایک تہذیب، روایت اور علامت کی حیثیت رکھتی ہے۔سچ تو یہ ہے علی گڑھ روایت کا دوسرا نام ہے۔ رشید احمد صدیقی کا خاکہ پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم رشید صاحب کا خاکہ نہیں پڑھ رہے بلکہ ان سے باتیں کر رہے ہیں۔

’ایک بستی ایک تہذیب‘اس خاکے میں الہ آباد کے ایک محلے یحییٰ پور کے حکیموں کے خاندان کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہاں پر اطہر پرویز کے دادا کی بڑی عزت تھی۔لوگ انھیں میر صاحب کہتے تھے۔ اس کی دو وجوہات تھیں ،ایک تو وہ معزز خاندان سے تھے دوسرے پولس میں تھے۔ان کے دادا نے مرتے وقت مولوی صاحب سے کہا تھا کہ میرے بچوں کا خیال رکھنا۔مولوی صاحب نے اس قول کا پاس مرتے دم تک رکھا۔ مینا پور کے ایک اور مولوی شفاء احمد عربی ،فارسی کے بڑے عالم تھے۔ان کے سر سید احمد خاں ،شبلی نعمانی ،جواہر لال نہرو اور موتی لال نہرو سے اچھے مراسم تھے۔نہرو جی ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ان لوگوں کے دلوں میں محبت اس قدر تھی کہ اپنے وعدے کو پورا کرنے کے لیے جان تک کی بازی لگا دیتے تھے۔

’قدسیہ آپا‘اس خاکے میں غیر معمولی شخصیت کی مالک قدسیہ آپا کی زندگی کے روز و شب کو بیان کیا گیا ہے۔جنھیں ادبی حلقوں میں بیگم زیدی یا قدسیہ آپا کے نام سے جانا جاتا ہے۔وہ ہندوستانی تہذیب کی علامت تھیں۔ وہ قدیم اور جدید تہذیب کا حسین امتزاج بھی تھیں۔دولت ،عیش وعشرت ،عہدہ یہ سب چیزیں دوسروں کے لیے اہمیت رکھتے ہوں لیکن ان کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتے تھے۔وہ مسلم یو نیورسٹی کے وائس چانسلر کرنل بشیر حسین زیدی کی بیوی اور پطرس بخاری کی بہن تھیں۔وہ پلک جھپکتے ہی کام کرنے کی عادی تھیں۔ان کے دماغ میں خیال اور عمل ایک ساتھ آتے جس طرح زندگی میں عجلت سے کام لیتی تھیں۔اس طرح مرنے میں بھی دیر نہ کی۔

قدسیہ زیدی نے ہندوستانی تھیٹر قائم کیا۔وہ ڈراموں کو ترجمہ کرتیں اور انھیں پروڈیوس بھی کرتیں۔ وہ ذہین بھی تھیں اور سمجھدار بھی۔ ہمیشہ مشکل کاموں کو پسند کرتیں ،جن گرہوں کو کوئی نہ کھول پاتا انھیں کھولنے کے لیے اپنے ناخونوں سے خون نکال لیتی تھیں۔ وہ محض قدسیہ آپا نہ تھیں بلکہ ہر مرض کی دوا تھیں۔ وہ بہت خوش مزاج ،ملنسار اور ہمدرد انسان تھیں۔ ان کے حسن سلوک میں جمال بھی تھا اور جلال بھی۔ وہ بہت سی کتابوں کی مصنف بھی تھیں اور مترجم بھی۔ جیسے گڑیا گھر ،شکنتلا ،خالد کی خالہ ،مٹّی کی گاڑی اور آزاد کا خواب وغیرہ ہیں۔ وہ جس ڈرامے کا ترجمہ کرتی اس کے اندر ڈوب کر رہ جاتی اور وہ ڈرامہ ان کی زندگی کا حصّہ بن جاتا تھا۔اطہر پرویز نے لفظوں کے ذریعے قدسیہ آپا کی جو تصویر بنائی ہے اس میں ان کی پوری زندگی نظر آتی ہے۔

’’پوچھتے ہیں وہ کہ،،اس کتاب کا آخری خاکہ ہے۔اس میں انھوں نے شعبہ اردو کے پروفیسر آل احمد سرور کا خاکہ پیش کیا ہے۔ پرویز صاحب کی ان سے پہلی ملاقات 1941 میں ہوئی۔ وہ ان کی شخصیت سے اتنا زیادہ متاثر ہوئے کہ ان سے ملنے کا موقع تلاش کرنے لگے۔ وہ مضمون لکھ کر سرور صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے ایک ہفتے بعد آنے کو کہا۔سرور صاحب کبھی کسی کام کو منع نہیں کرتے تھے۔اسی لیے کچھ جملے ان کا تکیہ کلام بن گئے :

> ’’آپ اطمینان رکھیں، مجھے آپ کا خیال ہے۔میں جو کچھ کر سکتا ہوں ضرور کروں گا۔‘‘6

1 اطہر پرویز، چہرہ بہ چہرہ رو بہ رو، مرتبہ، سیما پرویز، براؤن بک پبلی کیشنز، نئی دہلی، 2017، ص،17

2 ایضاً، ص،49

3 ایضاً، ص،83

4 ایضاً، ص،101

5 ایضاً، ص،107

6 ایضاً، ص،144

❑❑❑

Nighat
Department of Urdu
Aligarh Muslim University
Aligarh 202001(U.P)
nighatkhanurdu@gmail.com

روبی خاتون

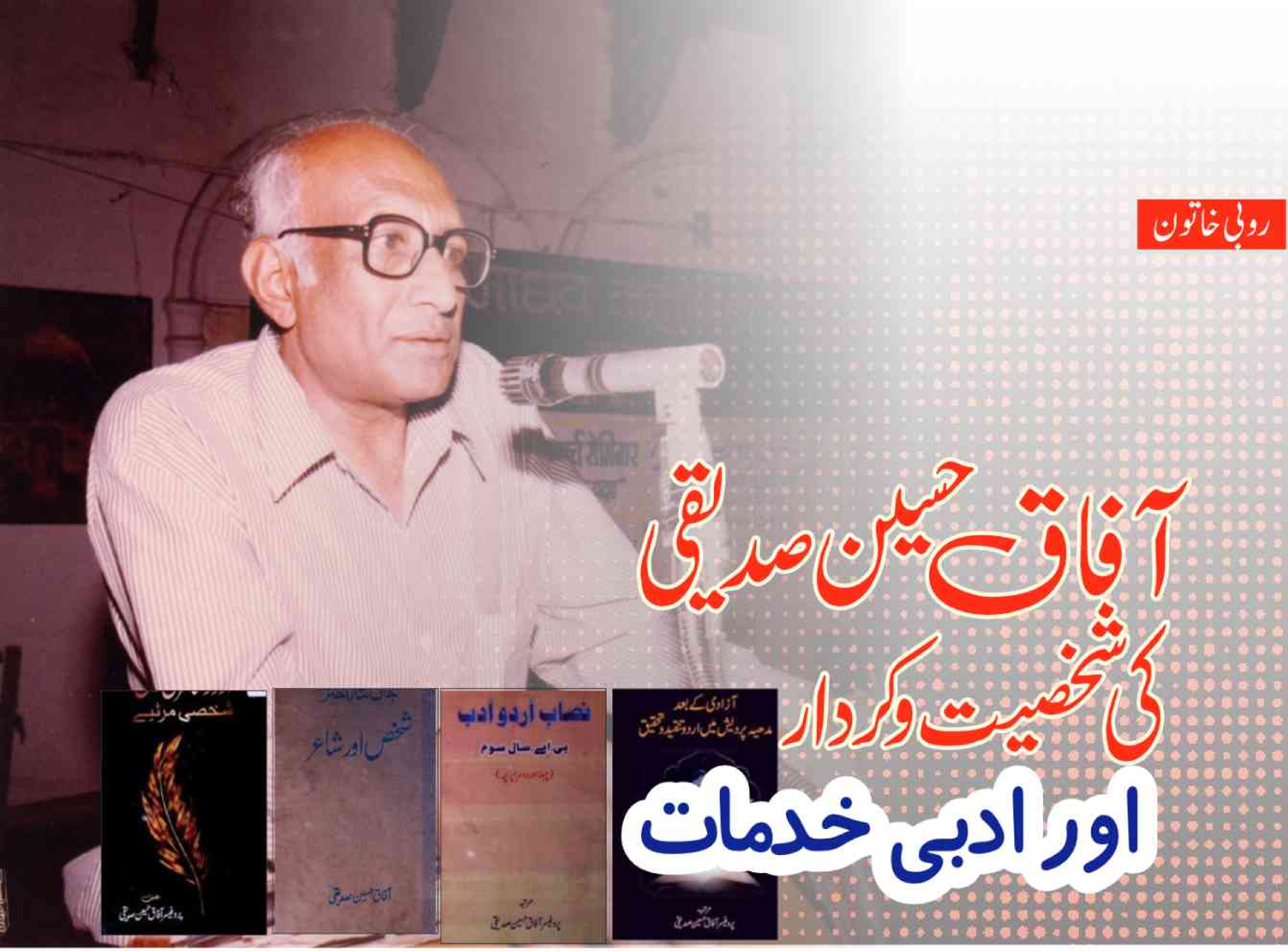

آفاق حسین صدیقی کی شخصیت و کردار اور ادبی خدمات

بیسویں صدی کا نصف آخر اردو ادب کی تاریخ میں بہت اہمیت کا حامل رہا ہے اس دور میں مختلف تحریکات نے جنم لیا اور ترقی کی منزل سر کیں ۔تحریکات کے علاوہ نظم و نثر کے میدان میں بیش بہا اضافے ہوئے چاہے تحقیق و تنقید، ناول و افسانہ ہو چاہے شاعری کی مختلف اصناف ۔اسی دور میں بھوپال میں بھی کئی ایسے محبان اردو پیدا ہوئے جنھوں نے نہ صرف اس شہر کی شہرت میں چار چاند لگائے بلکہ اس کی ادبی تاریخ میں مجاہد اردو کی حیثیت سے اپنے نام کا اندراج کرایا ،ایسی ہی مایہ ناز اور شہرت یافتہ شخصیتوں میں پروفسر آفاق حسین صدیق کا نام نامی بڑے احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔

وہ اچھے استاد، معتبر ناقد، سنجیدہ محقق ، ماہر لسانیات ، مقالہ نگار، طنز و مزاح نگار ، مفکر اور مورخ تھے، آفاق حسین صدیقی مرحوم تدریسی مراحل میں طالب علموں کے لیے ایک بہترین صلاحیت مند استاد کی صورت میں ۔پی۔ ایچ ۔ڈی میں بہترین نگراں کی حیثیت سے اس کے علاوہ تدریسی خدمات سے منسلک دوسرے فرائض کو بحسن و خوبی انجام دیا۔ سرکاری ملازمت سے سبک دوش ہونے کے بعد دوسرے اسکالرس کے لیے بہت معاون و مددگار ثابت ہوئے۔

علاوہ ازیں مختلف تنظیموں ،سرکاری غیر سرکاری اداروں کے لیے اردو زبان کی خدمات میں مدھیہ پردیش ایس سی ای آر ٹی ، این سی پی یو ایل اور این سی ای آر ٹی دہلی سے تشکیل و ترتیب دی جانے والی اردو ادب کی ترتیبی نصاب و کتب کی بے شمار تصنیفات و تالیفات میں آپ کی معاونت کا اندراج ہے۔ اردو زبان و ادب میں متعدد عناوین پر بے شمار تنقیدی و تحقیقی مضامین مختلف رسائل و جرائد ورسائل میں شائع ہو کر منظر عام پر آچکی ہے۔ سیمیناروں ادبی مجالسوں اور آکاشوانی دور درشن میں مختلف موضوعات پر مقالات و مضامین بھی پیش کیے ہیں ۔

آفاق حسین صدیقی جدید ادب میں قلم کار کے مابین ایک درخشندہ ستارہ کی مانند نظر آتے تھے۔ ان کے ادبی ذوق و شوق کا مظاہرہ ان کی تخلیقات اور تصنیفات میں بخوبی دکھائی دیتا ہے تنقید و تحقیق سے ان کا گہرا شغف رہا اور ادبی دنیا میں اسی حیثیت سے معتبر اور معروف تھے۔ انھوں نے تنقیدی اور تحقیقی مضامین کے علاوہ تقریباً تین کتابیں لکھی اور ایک کو مرتب کیا۔ جاں نثار اختر شخص اور شاعر، اردو شاعری میں شخصی مرثیے شائع ہوئی ۔اس تشکیل پر عمر کے

آخری حصے میں اور وفات کے بعد بھی اعزاز سے نوازے گئے، ترتیب شدہ کتاب آزادی کے بعد مدھیہ پردیش میں اردو تحقیق و تنقید اور مضامین کا مجموعہ نقوش رفتگان، بڑی اہمیت کی حامل ہے۔

'جاں نثار اختر شخص اور شاعر' موصوف کی پہلی مکمل تصنیف ہے یہ کتاب 1987 میں شائع ہوئی تھی یہ 144 صفحات پر محیط اور پیش لفظ کے علاوہ دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصہ کا عنوان 'شخص' ہے اس کے تحت دو ذیلی عنوانات ہیں 1۔ شخصیت کے مختلف پہلو 2۔ حالات زندگی۔ دوسرا حصہ جس کا عنوان شاعری ہے اس کے ذیل میں دس عنوانات قائم کر کے جاں نثار اختر کی شاعری کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا ہے۔

پیش لفظ میں مصنف نے لکھا ہے کہ کتاب تحریر کرنے کا محرک جان نثار اختر پر لکھا جانے والا ایک مضمون تھا جس کا آغاز خود جاں نثار اختر کی خواہش یا فرمائش پر ہوا تھا اس سے واضح ہوتا ہے کہ مصنف کے جان نثار اختر سے قریبی تعلقات تھے جس بنا پر پہلے حصہ میں مصنف نے جان نثار اختر کی شخصیت پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے وہ سنی سنائی باتوں پر مبنی نہیں ہے بلکہ مصنف کے مشاہدہ اور تجربے پر مبنی ہیں۔ اسی طرح حالات زندگی کے بیان سے گہری واقفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ مصنف نے جان نثار اختر کی شخصیت کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس سے شخصیت کے نہ صرف خد و خال واضح ہو گئے ہیں بلکہ شخصیت کی امتیازی خصوصیات اور اوصاف اس طرح سامنے آ گئے ہیں کہ ہم جاں نثار اختر کو اپنے سامنے بولتے، ہنستے، مسکراتے، چلتے پھرتے، گفت و شنید کرتے، شعر کہتے، شعر سناتے دیکھتے ہیں اور ان کی شخصیت کی امتیازی خصوصیات سے بخوبی واقف ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح ان کے حالات زندگی کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے مصنف نے ان کے حالات سے گہری اور وسیع معلومات کا ثبوت دیا ہے خود ان کی پیدائش سے لے کر وفات تک حالات کا بیان اس خوبی کے ساتھ کیا ہے کہ کوئی بھی اہم پہلو چھوٹنے نہیں پایا ہے اور ان کی زندگی کے تمام نشیب و فراز واضح ہو گئے ہیں۔ یہاں مصنف نے صحیح معنوں میں ایک دیانت دار اور سوانح نگار کا حق عطا کر دیا ہے اسی ذیل میں جان نثار اختر کے متعلقین صفیہ اختر اور خدیجہ اختر کے بارے میں بڑی باریک بینی اور تحقیقی بصیرت کا ثبوت دیا ہے صفیہ اختر کے حالات زندگی کے سلسلہ میں آفاق حسین فرماتے ہیں کہ

> ''صفیہ سراج الحق اردو کے ممتاز ترقی پسند شاعر اسرار الحق مجاز کی بہن تھیں۔ وہ 25 جنوری 1918 عیسوی کو بارہ بنکی کے مشہور قصبہ ردولی میں پیدا ہوئی تھیں۔ ان کے والد چودھری سراج الحق ردولی کے چودھریوں کے ایک معزز گھرانے سے تعلق رکھتے تھے چودھری سراج الحق کو تعلیم حاصل کرنے کا بڑا شوق تھا چنانچہ انھوں نے اپنے خاندان میں سب سے زیادہ تعلیم حاصل کی۔ انھوں نے لکھنؤ سے بی۔ ایل۔ ایل بی کی سند لیں اور اپنی خاندانی روایات سے الگ ہٹ کر سرکاری ملازمت کو ذریعہ معاش بنایا۔'' 1

> خدیجہ ہارون کا تعارف اس طرح انھوں نے کرایا ہے۔

> ''خدیجہ طلعت شیخ ہارون عرب کی صاحبزادی ہیں اور نانیہال کی طرف سے خدیجہ جان نثار اختر کی والدہ سید علی بلگرامی کی نواسی اور سید حامد حسین گرامی کی صاحبزادی تھی'' 2

'آزادی کے بعد مدھیہ پردیش میں اردو تنقید و تحقیق' آفاق حسین کی ترتیب شدہ کتاب ہے اور 2017 میں شائع ہوئی تھی۔ 162 صفحات پر مشتمل ہے اس میں 22 مضامین شامل ہیں۔ جسے مصنف نے مفصل طور پر واضح کیا ہے۔ اسی ضمن میں آفاق حسین کا مضمون 'مالوہ میں اردو' عنوان سے اس کتاب میں شامل ہے مالوہ میں اردو کی قدامت کب عمل میں آئی اس کا تاریخی جائزہ انھوں نے لیا ہے۔

قدیم زمانے سے مالوہ کا علاقہ شمالی ہند سے جنوبی ہند جانے کا رہ گزر تھا۔ مالوہ کے علاقے میں عربوں سے مسلمانوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا۔ 1042 میں ایک بزرگ عبداللہ شاہ چنگال نے عرب سے چل کر قندھار میں قیام کیا اور مذہب اسلام کا پیغام دیا وہ عوام کو رشد و ہدایت کی طرف گامزن کرتے تھے اس طرح وقتاً فوقتاً

دین اسلام سے واقف کراتے رہے۔علما وفضلا کا بھی اس راہ سے گزر ہوا اس سرزمین پر کئی مسلمان حکمرانوں نے بھی کئی بار حملہ کر کے تسلط قائم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ یہاں پر کئی بڑے بڑے حکمرانوں نے حکمرانی کی۔ بقول آفاق حسین صدیقی:

''1305 عیسوی سے 1699 عیسوی تک یہاں کسی نہ کسی حیثیت سے مسلمانوں کا تسلط قایم رہا جس کے نتیجہ میں اسلامی تہذیب وتمدن یہاں اپنے اثرات مرتب کرتی رہی یہ زمانہ ہندوستان میں ہند آریائی زبانوں کے ارتقاء کے لحاظ سے بڑا اہم زمانہ تھا۔خاص طور پر شمالی ہندوستان کے مختلف علاقوں میں ہند آریائی زبان نئی تہذیبی اور لسانی رشتوں کے اثرات کے تحت نیا چولا اختیار کر رہی تھیں۔صوفیوں اور فوجیوں کے ذریعے دور دراز کے علاقوں میں پہنچ کر اپنے قدم جمانے کی کوشش کر رہی تھیں ان میں سے ایک کھڑی بولی بھی تھی۔جس کی ارتقاء یافتہ شکل کو ہم آج اردو کہتے ہیں''3

'اردو شاعری میں شخصی مرثیے' آفاق حسین کی دوسری مکمل تصنیف ہے یہ کتاب 2023 میں شائع ہوئی تھی۔اس میں 240 اوراق ہیں اس کے حرف آغاز کے بعد آفاق۔افریں،عنوان سے پروفیسر عبدالحق (پروفیسر ایمیریٹس شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی دہلی) نے تحریر کیا ہے۔اس کتاب کی خاص بات یہ ہے کہ دور قدیم سے لے کر موجودہ عہد تک کسی ادبا نے شخصی مرثیہ نام سے کتاب نہیں لکھی ہے۔یہ کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہیں،اس میں عہد قدیم اور دور متوسطین میں دکنی دور کی شاعری میں شخصی مرثیہ کا جائزہ اور شمالی ہند کے عہد متوسطین میں کہے گئے شخصی مرثیوں کا جائزہ اور آزادی کے پہلے اور آزادی کے بعد اردو شاعری میں عزیز واقارب،معتبر ومعزز قائدین کی موت پر اور قریبی رشتہ داروں کی وفات پر شخصی مرثیے لکھے گئے ان تمام کا تذکرہ اس کتاب میں شامل ہے۔

مرثیہ گوئی کی ابتدا فارسی میں کربلائی مرثیہ سے ہوئی اسی کے زیر نگیں اردو شاعری بھی پروان چڑھنے لگی جس میں شاعروں نے کربلا کے علاوہ عزیز واقارب،دوست واحباب،قوم کے رہنماؤں پر مرثیہ گوئی کرنے لگ گئے۔

اس کے متعلق آفاق حسین صدیقی رقم طراز ہیں:

''اردو شاعری میں کربلائی مرثیوں سے الگ ہٹ کر اشخاص کی موت پر کہے گئے مرثیوں کے باقاعدہ رواج کا سلسلہ زین العابدین عارف کی وفات پر کہے گئے مرزا غالب کے مرثیہ سے ہوا۔اسی کے بعد مرزا غالب کی وفات 15 فروری 1869 پر مولانا حالی کے، مرثیہ غالب،،اور قربان علی سالک اور میر مہدی مجروح کے مراثی اشخاص کی وفات پر مرثیہ گوئی کے سلسلہ میں سنگ میل ثابت ہوئے۔اسی کے ساتھ مقدمہ شعر وشاعری میں مرثیہ کے ذیل میں مولانا حالی کے مباحث اور اشخاص کی وفات پر مرثیہ کہنے کے مشورہ نے اردو شاعری میں شخصی مرثیہ گوئی کے فروغ کی راہ ہموار کر دی۔''4

مجموعی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ آفاق حسین صدیقی کا انفعال زیادہ ہے لیکن تخلیق شدہ کتابیں کم ہیں جو سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے ان کا انداز بیاں نہایت دلکش سادہ اور سلیس ہے ان کے الفاظوں میں باریک بینی،گہرائی وگیرائی نظر آتی ہے تصنیفات وتالیفات کا مطالعہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر موضوع پر تنقید وتحقیق کا عنصر غالب ہے۔

حواشی

1 پروفیسر آفاق صدیقی۔جاں نثار اختر شخص اور شاعر،ص161

2 شاعر جلد 47 شمارہ 11 صفحہ 282

3 پروفیسر آفاق حسین صدیقی۔آزادی کے بعد مدھ پردیش میں اردو تحقیق وتنقید،ص۔1643

4 پروفیسر آفاق حسین صدیقی۔اردو شاعری میں شخصی مرثیے،ص2344

□□□

Rubi Khatoon
Saaskiye Hamidiya Arts & Commerce College
Barkatullah University
Hathi Khana Budwara
Bhopal-462001 (Madhya Pradesh)
dranjumara982618219@gmail.com

نعیمہ امتیاز شمع

نظم

شمعِ سوزاں کا سفر۔۔۔صبح کی پہلی کرن ہونے تک

عالم سوز میں اک شور بپا رہتا ہے
در و دیوار پہ جو حرفِ شکایت بن کر
رقص کرتے ہوئے بے وضع کئی ہیں سائے
کھینچ لیتے ہیں یہ نیندوں سے سکوں کی سانسیں
نبض رُکتی ہے نہ چلتی ہے قیامت جیسے
بن کے ہمدرد کئی سَرد ہوا کے جھونکے
پھونک دیتے ہیں بدن میں کوئی لغزش سی
دیر تک ذہن کے جوارتعاش چھو جاتے ہیں
ماہ وانجم کی سلگتی ہوئی نم آنکھوں سے
بونداحساس کی چھو جاتی ہے شبنم بن کر
رینگتی رات،پگھلتی ہوئی شمعِ سوزاں
کھینچتی رہتی ہے اشکوں کی لکیروں کاسفر
ڈوب جاتی ہے یہ دہلیز پہ شب ظلمت کی
تب کہیں آتی ہے اِک پہلی کرن صبح کی

Naima Imtiyaz Shama
39, RNA Sapphire
Flat 902 Azad Nagar 2
Veera Desai Rd,
Andheri W Mumbai-400053 (M.S)

فرحین شکیل

منزل ہے اس کی ذلت و رسوائی میرزا
ہم معترف ہیں عشق ہے اک کھائی میرزا
بیٹھے ہوئے ہیں ہم بھی یوں ہی محوِ یاس و غم
امید آج تک بھی نہ بر آئی میرزا
طاقت رہی نہ سر بھی اٹھانے کی ضعف سے
ایسی شکست دل نے مرے پائی میرزا
نکلے تھے جیسے آپ کبھی کوئے یار سے
میں بھی اسی طرح سے نکل آئی میرزا
دردِ جگر نے میرے بھی کچھ آپ کی طرح
حد سے گزر گیا تو دوا پائی میرزا
مرنے کی دل نے اور بھی تدبیر کی تو تھیں
لیکن نصیب، موت نہیں آئی میرزا
دوزخ میں ڈال دیں گے اگر ہم بہشت کو
ہوگی کہاں خدا سے شناسائی میرزا
تم ہی نہ تھے جو محوِ تماشا تھے رات دن
ہم بھی ہیں اس جہاں کے تماشائی میرزا
تم کو بھی مل سکی نہ کوئی درد کی دوا
اپنی بھی ہو سکی نہ مسیحائی میرزا
میرے بھی غم کی تاب نہ غمخوار لا سکے
میں بھی بیانِ عشق پہ پچھتائی میرزا
آتے ہیں غیب سے ہی مضامیں خیال میں
اب آپ کی یہ بات سمجھ آئی میرزا
میرے بھی دوست مجھ کو نصیحت ہی کرتے ہیں
میں نے بھی چارہ سازی نہیں پائی میرزا
کہنے گئی تھی ان سے سحر اپنے دل کا حال
کہنے لگی تو کچھ بھی نہ کہہ پائی میرزا

Farheen Shakeel
Resarch Scholar, AMU
Medical Colony, Begam Azizun Nisa Hall
Aligarh Muslim University
Aligarh-202002 (U.P)
farheenshakeelf684@gmail com

انزلا بی

صدائے بلبل

شام نے چادر اوڑھی سنہری
ہوا نے گیت کوئی گایا مدھم
ڈھلتا سورج آہستہ آہستہ
افق کے پردے میں چھپ گیا
ادھر ایک طاؤس تھکا ہوا تخت سے نیچے اترا
اور تاج اپنی مرضی سے اس جہان کے نام کر
ویرانوں میں چلا گیا
فضا میں اک اداسی بکھری
پھول خاموش ہو گئے سب
درختوں کی شاخوں پر بیٹھے پرندے
روزمرہ کی آخری گفتگو کر کے
اپنی اپنی سمتوں کو لوٹ رہے ہیں
مگر۔۔وہیں اک اداس بلبل
محل کے جھروکوں سے دیکھتی تھی
پکارتی تھی۔۔۔
ارے! تیز رفتاری سے چلنے والوں
ادھر بھی دیکھو۔۔
تمھارے اجداد کی نشانیاں سب
کھنڈر میں تبدیل ہو رہی ہیں
تمھاری مکاریوں کے باعث
یہ بستیاں اور مکاں تمھارے
اجاڑ ہیں سب!
ذرا علم و حکمت کی شمعیں بڑھاؤ
امن و گیان کے دیپ جلاؤ
مہذب قوموں کے نشاں تھے تم تو
وزیر و خلفاء۔میاں تھے تم تو
یہ کیسی صورت بنالی تم نے
یہ پیٹ باہر ہیں کیوں نکلے؟
یہ پانوں کی پیک، فریب کاری
یہ کام چوری، ریا کاری
یہ گندے رستے غلیظ پیشے
تمھاری تہذیب کے نشاں نہیں تھے
تمھاری مکاریوں کے کارن
یہ حالات۔۔
اپنے تم نے خود کیے ہیں
ذرا علم و حکمت کی شمعیں جلاؤ
ذرا اپنے اندر تمیز لاؤ!
نہیں تو اس جرجر محل کی مانند
تمھارے مکاں سب گر جائیں گے
تمھارے نشاں سب مٹ جائیں گے
آہستہ آہستہ/اس بلبل کے نالے
اس چمک دمک کے شور وغل میں/ گم ہوئے جاتے تھے
کون سنتا اس کی صدائیں؟
بازار کی ان رنگینیوں میں/سبھی تو مدہوش جا رہے تھے
رات!/ڈھلتے ڈھلتے پھر سے
چاند کا دیا جلاتی ہے/اور فلک کی پیشانی پر
تاروں کی افشاں بکھر جاتی ہے/ بلبل پھر نئی صبح کے انتظار میں
اپنی آنکھیں موند لیتی ہے/اس آرزو میں کہ۔۔۔
کبھی تو اس کی صدا سنے گی/کبھی تو امید کی پو پھٹے گی!

Unzila Bi
Research Scholar, Department Of Urdu
Arts Faculty
University Of Delhi
Delhi-110007

افسانے

نشاں زیدی

بھروسہ

کئی دن کی بارش کے بعد آج تیز دھوپ نکلی تھی۔اس بار بارش بھی خوب ہوئی۔شہر کے شہر علاقے کے علاقے تباہ ہوگئے۔لوگ گھر سے بے گھر ہوگئے تھے اور پہاڑوں پر تو جیسے قیامت ہی آگئی تھی۔ تیز دھوپ نے جہاں گرمی بڑھا دی تھی، وہیں ہلکا سا سکون بھی مل رہا تھا۔رابعہ نے سارے کپڑے دھوپ میں پھیلا دیے تھے۔مشین میں کپڑے چاہے کتنے بھی سکھا لو لیکن جب تک دھوپ نہ لگے کپڑوں میں برسات کی بو آتی رہتی ہے۔فرحان ایک ماہ کے دورے پر شہر سے باہر گئے ہوئے تھے۔مریم اسکول چلی گئی تھی اور روشن آرا تلاوت کررہی تھیں۔گھر کے سارے کام نپٹاتے نپٹاتے گیارہ بج گئے تھے رابعہ بھی تھوڑی دیر آرام کرنے کے لیے کمرے میں گئی ہی تھی کہ دروازے کی بیل بج گئی۔اس وقت کون ہوسکتا ہے۔رابعہ نے دروازہ کھولا سامنے اظہر بھائی اور رضیہ باجی کو دیکھ کر وہ چونک گئی۔

’’السلام علیکم اس وقت آپ۔‘‘

’’نہیں نہیں ہمارا بھوت‘‘اظہر بھائی نے گھر میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

’’ارے بھئی ہم اپنی خالہ سے ملنے آئے ہیں۔‘‘

’’میں کب کہہ رہی ہوں کہ آپ مجھ سے ملنے آئے ہیں،لیکن یہ بات تو پکی ہے کہ میری پیاری بہن مجھ سے ملنے آئی ہیں۔‘‘

’’کون ہے دلہن؟‘‘ روشن آرا نے کمرے سے آواز لگائی۔‘‘

’’اماں آپ کے بھانجے صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔‘‘

اظہر روشن آرا کے بھانجے تھے اور رضیہ رابعہ کی خالہ زاد بہن۔اظہر کی شادی میں ہی خوبصورت سی شوخ رابعہ پر فرحان کا دل آگیا تھا اور روشن آرا بیٹے کی پسند کو بہو بنا کر گھر لے آئی تھیں۔روشن آرا کے دو ہی بچے تھے ثمینہ اور فرحان۔ثمینہ بچوں کی چھٹیوں میں سال میں بس ایک بار ہی آتی تھی۔فرحان اور رابعہ کو قدرت نے ایک بیٹی سے نوازہ تھا، جو اب آٹھویں کلاس میں پڑھ رہی تھی۔مریم اسکول چلی جاتی اور فرحان آفس سارا دن ساس بہو گھر میں اکیلی رہتیں۔

’’اظہر! بچے اسکول سے آنے والے ہوں گے چلو چلتے ہیں۔‘‘ رضیہ نے اظہر کی طرف دیکھا۔

’’ابھی تھوڑی دیر رکو،خالہ کے ہاتھ کے پکوڑے کھا کر چلیں گے۔تمھاری بہن کے ناشتہ میں تو مزا آیا نہیں۔‘‘اظہر نے ہنستے ہوئے کہا۔

’’ہاں یہ صحیح ہے میں پکوڑے بناتی ہوں۔رمضان کے بعد پکوڑے کھائے بھی نہیں ہیں۔

’’رمضان میں تو پکوڑے روز ہی بنتے ہیں۔رضیہ نے بیٹھتے ہوئے کہا۔‘‘

’’رمضان میں جس طرح روزے واجب ہیں،اسی طرح پکوڑے واجب ہیں۔‘‘

’’چلو بناتی ہوں۔میرے ہاتھ کے پکوڑے ہماری دلہن کو بھی بہت پسند ہیں۔‘‘روشن آرا نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''ارے خالہ آج کل کی بہوؤں کو ساسوں کے ہاتھ کا سب کچھ بہت پسند ہے۔'' اظہر زیرِ لب مسکرائے۔

''اظہر بھائی۔'' رابعہ نے آنکھیں دکھائیں۔

''خالہ آپ کے زمانے کی بھوئیں بھولی بھالی ھوتی تھیں لیکن ساسوں کی برائی کرنے میں ماھر ھوتی تھیں۔ مجھے یاد ھے جب ھم بچپن میں نانی کے گھر جاتے تھے، تو آپ اور امی مل کر دادی کے بنائے ھوئے کھانے کی کتنی برائی کرتی تھیں لیکن آج کل کی بھویں چالاک ھیں۔ وہ سوچتی ھیں کہ ساس کے بنائے ھوئے کھانے کی تعریف کریں گے، تو آرام سے بیٹھے بیٹھے کھانے کو ملے گا۔''

''خالہ آپ کے زمانے کی بہوئیں بھولی بھالی ہوتی تھیں لیکن ساسوں کی برائی کرنے میں ماہر ہوتی تھیں۔ مجھے یاد ہے جب ہم بچپن میں نانی کے گھر جاتے تھے، تو آپ اور امی مل کر دادی کے بنائے ہوئے کھانے کی کتنی برائی کرتی تھیں لیکن آج کل کی بہویں چالاک ہیں۔ وہ سوچتی ہیں کہ ساس کے بنائے ہوئے کھانے کی تعریف کریں گے، تو آرام سے بیٹھے بیٹھے کھانے کو ملے گا۔''

''اظہر بھائی رابعہ نے ہاتھ جوڑتے ہوئے منہ بنایا۔''

اظہر اور رضیہ کے جانے کے بعد وہ برتن سمیٹ رہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

''اف اب کون آ گیا۔ اس نے دروازہ کھولا سامنے ایک لڑکی کھڑی تھی۔ پورا چہرا اسٹول سے ڈھکا ہوا تھا صرف آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔

''میڈم۔''

''ارے ہمیں کچھ نہیں چاہیے۔''

''میڈم میں کچھ سیل نہیں کر رہی ہوں۔'' پلیز میری بات تو سنئے۔

''اچھا اندر آ جاؤ۔'' کئی مرتبہ منع کرنے کے بعد اس بار رابعہ کو اس کے اوپر ترس آ گیا۔

''میڈم میں آپ کا روم کرائے پر لینے آئی ہوں۔''

''لیکن ہم کرائے پر نہیں دیتے ہیں۔''

''دیکھئے میں بہت مجبور ہوں۔ میں نے کئی جگہ روم تلاش کر لیا لیکن میرے نام کی وجہ سے لوگ روم دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ بہت دیر تک اس نے خوشامد کی روشن آرا بھی ہال میں آ گئی تھیں۔ نہ جانے اس کی باتوں میں کیسی کشش یالا جادو تھی کہ دونوں کا دل پسیج گیا اور اسے کمرا دینے کے لیے تیار ہو گئیں۔

اوپر کے کمرے میں روبی شفٹ ہو گئی تھی اس کا مختصر سا سامان تھا بیڈ وغیرہ پہلے سے پڑا تھا۔ اس نے اپنے حسن سلوک سے ایک ہفتہ میں روشن آرا اور رابعہ کا دل جیت لیا تھا لیکن فرحان نے خوب واویلا کیا۔

''کیا حماقت کا کام کیا ہے، آج کل کا زمانہ جانتی ہو کیسا ہے۔''

''ارے فرحان خواہ مخواہ ناراض ہو رہے ہو بیٹا وہ ایسی نہیں ہے اور میں نے ہاں کی ہے۔'' روشن آرا نے سمجھایا۔

''اماں آپ آج کل کے زمانے کو نہیں جانتی ہیں، لیکن رابعہ تو۔''

''تم زیادہ تر باہر کے دورے پر رہتے ہو، ہم لوگوں کے لیے یہ تین کمرے کافی ہیں۔ پورا گھر دن بھر خالی پڑا رہتا ہے۔ اوپر تو جا کر کوئی جھانکتا بھی نہیں۔''

فی الحال فرحان خاموش تو ہو گئے تھے لیکن غصہ کم نہیں ہوا تھا۔

روبی نے کچھ ہی دنوں میں ان تینوں کا دل جیت لیا تھا۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ تینوں کے ساتھ ان کی ہم عمر بن کر رہتی۔ مریم کے ساتھ کیرم، بیڈ منٹن کھیلتی، رابعہ کے چھوٹے موٹے کام کر دیتی اور روشن آرا تو اس سے اپنے دل کی تمام باتیں کرتیں۔ وہ ان کے سر میں مالش کرتی پیر دباتی منع کرنے پر برا مان کر بیٹھ جاتی۔ لیکن وہ کبھی کبھی بات کرتے کرتے اداس ہو جاتی اور اس کی آنکھوں میں اداسی چھا جاتی۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ بہت

مجبوری میں گھر سے نکلی ہے ۔اس کے علاوہ گھر پر کوئی کمانے والا نہیں ہے۔باپ کا انتقال ہو چکا ہے ۔ایک چھوٹی بہن ،ماں اور ایک اپاہج بھائی ہے۔جس کی ذمہ داری اس کے کاندھوں پر ہے۔

اس دن رابعہ کے سر میں درد ہو رہا تھا اور مریم کو اسکول کا کچھ سامان لینے جانا تھا۔مریم ضد کر رہی تھی ۔

''آنٹی کیوں پریشان ہو رہی ہیں میں چلی جاتی ہوں ۔''

''تم ؟'' رابعہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''ہاں مما ضروری سامان ہے ،میں روبی آپی کے ساتھ جا کر لے آتی ہوں ۔''

''ٹھیک ہے کہتے ہوئے وہ مڑی ہی تھی کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی دوسری طرف فرحان تھے ۔

''رابعہ میرا بیگ تیار کر دینا کل صبح مجھے سولن کے لیے نکلنا ہے۔''

''او کے''

''کیسے بول رہی ہو سب خیریت تو ہے ۔''

''سر میں درد ہو رہا ہے اور مریم کو اسکول کے لیے میپ لینے جانا ہے۔''

''اکیلے مت بھیجنا۔''

''نہیں بھئی اکیلے کہاں بھیجتی ہوں'' روبی کے ساتھ بھیج رہی ہوں۔''

''ہرگز ہرگز نہیں ۔'' ''تم کیسے اس پر بھروسہ کر سکتی ہو۔''

''فرحان وہ بہت مجبوری میں گھر سے نکلی ہے اور تم اس پر اتنا شک کرتے ہو۔''

''مریم مریم !فون رکھ کر اس نے آواز دی ۔''لیکن وہ دونوں جا چکی تھیں ۔

وہ تیزی سے بالکونی میں آئی لیکن نظر نہیں آئیں ۔وہ بے چینی سے بالکونی میں ٹہلنے لگی ۔نہ جانے کون کون سے خیال اس کے ذہن میں آ رہے تھے ۔''اگر کچھ گڑ بڑ......نہیں نہیں......ایسا نہیں ہو سکتا۔ جو جو دعائیں یاد تھیں وہ سب پڑھ لیں شکرانے کے نفل مان لیے ۔

''اماں اماں دعا کیجیے ،میری بچی صحیح سلامت آ جائے ۔''

''تم فکر مت کرو آ جائے گی ۔'' روشن آرا کے چہرے پر بھی انجانہ خدشہ تھا۔

''اماں مریم کو اگر کچھ ہو گیا تو فرحان مجھے مار ڈالیں گے اور میں اپنی بچی کے بغیر کیسے......اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

انھیں گئے ہوئے پورا ایک گھنٹا ہو گیا تھا۔وہ تیزی سے پھر بالکنی میں آئی ۔کل سے نوراتر شروع ہونے والے تھے گھر کے سامنے پوجا کے سامان کی بہت سی دکانیں لگی تھیں ،ان پر بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی ۔اب دور دور تک کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

رابعہ ہال میں صوفے پر آ کر بیٹھ گئی ۔اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ دروازے پر دستک ہوئی ۔اس نے جلدی سے دروازہ کھولا ۔

''اللہ کا لاکھ لاکھ شکر تم آ تو گئیں ۔مریم کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ۔

دن معمول کے مطابق گزر رہے تھے ۔فرحان کو گئے ہوئے پندرہ دن ہو گئے تھے ۔اس دن روبی جب باہر سے آئی بہت اداس تھی ۔اس کی ایک خوبی یہ تھی وہ اپنی پریشانی جلدی بتاتی نہیں تھی ۔لیکن اماں نے جب اس سے پوچھا تو اس کی آنکھوں سے آنسو کے قطرے گر کر آنچل میں جذب ہو گئے ۔

''میری چھوٹی بہن کی شادی طے ہو گئی ہے، امی نے اگلے مہینے کی تاریخ رکھی ہے ۔سب انتظام مجھ ہی کو کرنا ہے،اس نے ایک سانس میں ساری بات بتا دی ۔ اف کیسے کروں؟اس نے گہری سانس لی ۔

''ہو جائے گا سب انتظام ۔اللہ مدد کرے گا ۔'' روشن آرا نے تسلی دی ۔

''اس دن روبی گھر پر وقت سے پہلے آ گئی تھی اس کے پاس دو بڑے بڑے بیگ تھے ۔آنٹی یہ بیگ رکھ لیجیے ۔''اس کی سانس پھول رہی تھی ۔وہ بیگ رکھ کر اوپر گئی تھی ،اتنے میں فرحان کی ویڈیو کال آ گئی ۔

''مریم کہاں ہے ۔''

''اپنے کمرے میں ہے ۔''

''یہ اتنے بڑے بڑے بیگ کس کے ہیں ۔''فرحان کی پارکھی

آنکھوں نے ویڈیو کال پر بھی بیگ دیکھ لیے تھے۔
''فرحان تمھیں تو سی بی آئی میں ہونا چاہیے تھا۔'' روبی کے بیگ ہیں۔''
''یہ کیوں رکھ لیے۔'' کچھ اس میں الٹا سیدھا نہ ہو۔''
''ہاں اس میں بم ہیں۔'' رابعہ نے فون رکھتے ہوئے کہا۔
اس نے فرحان سے تو کہہ دیا تھا لیکن جلدی سے بیگ کھول کر دیکھے۔ چار پانچ جوڑے، چوڑی، چپل اور گھر کا کچھ ضروری سامان دونوں بیگ میں رکھا تھا۔ افف فرحان کتنا وہم...... یہ کہہ کر اس نے بیگ کی زپ بند کی۔

> کانوں اور آنکھوں پر یقین نہیں ہو رہا تھا۔ پولیس نے ایک بیوٹی پارلر پر چھاپا مارا ہے، جہاں سے پانچ لڑکیوں کو گرفتار کیا گیا ہے، پولیس مزید تحقیقات کر رہی ہے۔

اس دن وہ دونوں ہال میں بیٹھی ہوئی ٹی وی پر پاکستانی سیریل ''میں منٹو نہیں ہوں'' دیکھ رہی تھیں کہ بیل بجی دیکھا سامنے روبی کھڑی تھی۔ اس کا پورا چہرا بلیو کلر کے پرنٹیڈ اسٹول سے ڈھکا ہوا تھا۔
''آنٹی یہ چابی رکھ لیجیے۔ میں کہیں کام سے جا رہی ہوں۔''
''اور تمھارے بیگ۔ شام کے وقت کہاں جا رہی ہو، واپس کب تک...... رابعہ نے کئی سوال ایک ساتھ کر ڈالے۔''
''آنٹی میں آ کر بتاتی ہوں ابھی میں جلدی میں ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ تیزی سے اتر گئی۔
روبی کو گئے ہوئے پورا ایک ہفتہ ہو گیا تھا، اس کا فون بھی بند جا رہا تھا۔ مریم موبائل پر گیم کھیل رہی تھی۔ روشن آرا بالکونی میں ٹہل رہی تھیں۔ دروازے کی بیل بجی۔ رابعہ نے جلدی سے دروازہ کھولا۔ دوسری طرف سامنے والے فلیٹ کی مدھو تھالی لیے کھڑی تھی۔ مدھو ہمیشہ مریم کے لیے نوراتر کے آخری دن تھالی لاتی تھی۔ آج بھی وہ تھالی لیے کھڑی تھی، جس میں حلوہ، پوری، ابلے چنے، ناریل کا ٹکڑا، کلاوا، ایک کیلا اور بیس روپے رکھے تھے۔
''اوہ مدھو مریم اب کوئی چھوٹی کنیا تھوڑی ہے۔''
''ہمارے لیے تو جب تک اس کی شادی نہیں ہو جاتی وہ کنیا ہی ہے۔'' مدھو نے مسکراتے ہوئے کہا۔
وہ تھالی رکھ ہی رہی تھی کہ فون کی بیل بج اٹھی۔ دوسری طرف فرحان تھا۔
''آج کی نیوز دیکھی۔''
''تمھیں تو پتہ ہے میں نیوز نہیں دیکھتی۔''
خبریں کچھ ہوتی نہیں ہیں۔''
''ارے فلاسفی بعد میں جھاڑنا جلدی ٹی وی کھولو اور نیوز دیکھو۔''
فرحان نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔
اس نے جلدی سے نیوز چینل لگایا۔
کانوں اور آنکھوں پر یقین نہیں ہو رہا تھا۔ پولیس نے ایک بیوٹی پارلر پر چھاپا مارا ہے، جہاں سے پانچ لڑکیوں کو گرفتار کیا گیا ہے، پولیس مزید تحقیقات کر رہی ہے۔ اینکر کی آواز ہال میں گونج رہی تھی۔ ٹی وی اسکرین پر تصویر چل رہی تھی۔ سب کے چہرے ڈھکے ہوئے تھے۔ ایک لڑکی کا چہرا بلیو کلر کے پرنٹیڈ اسٹول سے ڈھکا ہوا تھا۔ گھر میں سناٹا چھا گیا تھا ہم تینوں ایک دوسرے کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔
''مما اب کیا ہوگا۔'' مریم کانپتے ہوئے اس سے لپٹ گئی۔
دروازے کی بیل بجی۔ رابعہ نے پوری ہمت سمیٹ کر دروازہ کھولا۔ دوسری طرف ایک دبلی پتلی لڑکی کھڑی تھی۔
''میں روبی کی بہن ہوں بیگ دے دیجیے۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔
رابعہ نے تیزی سے دونوں بیگ گھسیٹ کر اس کو دیے اور دروازے کو تیزی سے بند کر لیا۔

□□□

Dr.Nisha Zaidi
B-63/S-2 D.L.F. Colony Sahibabad,
Distt- Ghaziabad-201005 (U.P)

سیلاب

سعدیہ فاطمہ عبدالخالق

شام ہو چلی تھی سورج کی روشنی چاروں طرف مدھم ہوتی جا رہی تھی، یوں لگ رہا تھا کہ کچھ ہی دیر میں اندھیرا اپنا ڈیرا جمائے گا، زینب اپنے چھوٹے سے جھونپڑے کے باہر ایک مٹی کے تودے سے ٹیک لگائے گم سم بیٹھی تھی کچھ ہی فاصلے پر تین سالہ ننھی کرن اچھل اچھل کر کھیل رہی تھی وہ کھیل میں اتنی مگن تھی کہ اسے اندھیرا بڑھنے کا احساس تک نہیں تھا، ماں کی موجودگی اسے ذہنی تحفظ دے رہی تھی، جھونپڑے کے پیچھے سے فتح خان کی آمد ہوئی وہ سر پر لکڑیوں کا گٹھڑ لیے وارد ہوا، کرن دوڑتی ہوئی آئی اور بابا بابا کہتی ہوئی فتح خان کے پیروں سے لپٹ گئی، فتح خان نے تیزی سے اسے جھٹک کر پرے ہٹا دیا، کرن مایوس ہو کر پیچھے ہٹ گئی، زینب نے بھی کرن کو ناگواری کے احساس میں دیکھا۔

فتح خان نے گٹھڑ زمین پر پٹخا اور کہا کہ، لے، جے نا روٹی پکا لے۔

اسے پتہ تھا کہ زینب لکڑیوں کے انتظار میں بیٹھی ہے، معمول کے مطابق زینب جھونپڑے میں چراغ جلا کر رات کے کھانے کی تیاری میں لگ گئی، ایک چھوٹے سے تھیلے سے مرچیں، مٹر اور ٹماٹر نکال کر کچھ ہی دیر کی محنت میں وہ روٹی اور سبزی بنا کر کھانا تیار کر چکی تھی۔

فتح خان کو آواز دی۔۔۔۔اوئے فتو کھانا لگ گیا ہے آجاؤ،

ایک چھوٹی تھالی میں کرن کو بھی ناگواری کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ، سبزی کے ساتھ روٹی دی گئی، وہ بھی چپ چاپ روٹی کھانے لگی، وہ فتح خان اور زینب کی اس طرح کی نفرت کو نہیں پہچانتی تھی، جتنی ضروریات مل جاتی وہی اس کی دنیا ہوتی، کرن نے روٹی کھائی اور ہاتھ دھونے کے لیے چلی گئی، پانی سے بھری بالٹی اس کے ننھے پیروں سے ٹکرائی اور وہ دھڑام سے نیچے گر پڑی اور مااااں۔ کہتے ہوئے زور زور سے رونے لگی، تب ہی زینب کے اندر کی چھپی ممتا کچھ لمحے کے لیے جاگ اٹھی، وہ دوڑ کر گئی اور کرن کو گود میں اٹھا کر اپنے سے قریب کیا۔

ہائے!! میرا ہبلو۔۔۔۔۔میرا ہبلو، کہتی ہوئی رونے لگ گئی

فتح خان نے بھی اپنے آنسو ضبط کرنے کی کوشش کی لیکن کر نہیں پایا اور آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے، زینب نے کرن کے پیروں کو اپنے ہاتھوں سے دھول جھٹک کر صاف کیا اور زمین پر چٹائی بچھائی اور اس پر مختصر سا بستر لگا کر اسے سلانے کے لیے بستر پر لٹا دیا، کچھ ہی دیر میں کام سے فارغ ہونے کے بعد نہ چاہتے ہوئے بھی زینب آج کرن کے بازو کو چمٹ کر اس کے گردن کے نیچے اپنا بازو پھیلا کر سو گئی، لیکن نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی، فتح خان بھی چارپائی پر نیند کے لیے کوشش کر رہا تھا، نیند جیسے اس کی آنکھوں سے اڑ چکی تھی بار بار کئی مناظر سامنے آ رہے تھے، جھونپڑے میں چراغ کی مدھم روشنی پھیلی ہوئی تھی اور زینب کے ذہن میں بھی کئی ایک مناظر ابھر رہے تھے۔

مانو جیسے کل ہی کی بات ہے۔۔۔۔۔۔ کہ وہ سیلاب کے قہر میں سب کچھ گنوا بیٹھے تھے، ان کے پاس سوائے جان کے کچھ نہ بچا تھا، اس جھونپڑے کو ترتیب دے کر نئے سرے سے زندگی کو شروع کیا تھا، کئی مناظر ایک ایک کر کے نگاہوں میں دھندلا رہے تھے، فتح خان بھی اپنی سوچوں میں گم تھا، اسے بھی وہی طوفانی برسات یاد آ رہی تھی۔

ببلو نے ماں کو پکار کر کہا کہ ماں میں چھت پر پتنگ اڑانے جا رہا ہوں۔

ماں نے کہا بیٹا چھت کے سوکھے کپڑے ذرا لا کر دینا بہت کالے بادل آئے ہیں۔

ببلو نے جواب دیا ابھی نہیں ماں، تم بھی اوپر آ جاؤ ابھی پتنگوں کا مقابلہ رہے گا، بہت مزہ آئے گا، کہتے ہوئے وہ تیزی سے لوہے کی سیڑھیاں چڑھ گیا، اس کا پاؤں جال میں الجھتے الجھتے رہ گیا۔

ہائے اللہ۔۔۔۔ زینب کا دل دھک سے رہ گیا، یہ بچہ بھی نہ ایک دن بڑی مصیبت لائے گا۔۔۔۔۔ وہ بڑبڑائی،

فتح خان بھی اپنی سائیکل باہر لگا کر ہاتھ میں تھیلا اٹھائے اندر داخل ہوا ببلو پر نظر پڑ چکی تھی۔

وہ سبزی ترکاری اور سامان سے بھرا تھیلا زینب کو پکڑاتے ہوئے کہنے لگا، جے نا تو نے ببلو کو لاڈ پیار میں بہت بگاڑا ہے، وہ اب بارہ سال کا ہو چکا ہے، ایک ہی اولاد ہے کہہ کہہ کر ڈھیل دے رکھی ہے۔

ہاں تو کون سا غلط کہتی ہوں، میں نے کون سا دس بچے پالنے ہیں، میرا ایک ہی تو جگر کا ٹکڑا ہے، زینب نے اپنے بڑے سے رنگین دوپٹے کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

بوندا باندی شروع ہو چکی تھی۔

فتح خان کے چھوٹے سے صاف ستھرے گھر کے دو کمرے جس پر پرانے طرز کی چھت ٹکی ہوئی تھی مختصر سے دالان کے کونے میں کچن کا سامان چولہا چکی جمی تھی، گھر کی رنگین دیواروں کو زینب نے اپنے ہاتھ سے بنائی گئی کئی چیزوں سے سجا رکھا تھا جس سے گھر کی خوبصورتی میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔

آنگن کے کھلے حصے سے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آ رہی تھیں اور بوندا باندی کے موٹے موٹے قطرے آنگن میں پڑی تھال پر ٹناٹن آواز کر رہے تھے، پھر بجلی کی کڑک بھی ہونے لگی زینا نے ایک کونے میں تھیلا رکھا اور اپنے دونوں ہاتھوں کو سر پر پھیلاتے ہوئے باہر کے دروازے کی طرف یہ کہتے ہوئے دوڑی کہ میں سپنا کو آواز دیتی ہوں، اس نے چارپائی پر جوار دھو کر سوکھنے رکھی تھی، اسے اپنے سے زیادہ پڑوس میں سپنا کی فکر تھی۔

وہ دروازے میں ہی کھڑے ہو کر چلائی۔۔۔۔ سپنا۔۔۔ اوئے سپنا۔۔۔۔۔ سپنا۔۔۔۔۔

سپنا سامنے ہی نظر آئی وہ اور اس کا شوہر کشور جلدی جلدی چار پائی سے جوار سمیٹ رہے تھے، سپنا نے لش لش کرتی ساڑی کے پلو کا گھونگھٹ درست کیا اور جلدی جلدی چار پائی پر سے جوار سمیٹنے لگی۔

زینب نے پھر پکار کر پوچھا سپنا، رانی کہاں ہے وہ ڈر جائے گی بجلی کی کڑک سے۔

سپنا سمجھ گئی، کہ دیدی بہت فکر مند رہتی ہیں، فوراً سے اونچی آواز میں کہا کہ ہاں دیدی بس سمیٹ ہی رہی ہوں اور وہ نا، رانی، پالنے میں سو رہی ہے، دیدی تم ببلو کو دیکھو، بارش کے آثار صحیح نہیں لگ رہے ہیں، سپنا نے ببلو کو چھت پر دیکھ لیا تھا۔

تب تک ببلو سوکھے کپڑے لے کر دندناتے ہوئے نیچے آیا اور اپنی اچھل کود سے اپنی آمد کا احساس دلا گیا۔

سپنا کی چھ ماہ کی بچی، گول مٹول سی رانی، زینب، فتح خان اور ببلو کی لاڈلی تھی، ببلو اپنے گھر کا اکلوتا چراغ، پڑوس کی سپنا ماسی کی لڑکی ننھی سی رانی کو پر بہت جان لٹاتا، کچھ دن پہلے ببلو جب اپنے بابا کے ساتھ قریبی گاؤں کے میلے میں گیا، تب وہاں سے ببلو نے رانی کو موتیوں کا تاج لا کر دیا، پالنے میں ہی اس نے رانی کے سر پر تاج پہنایا تھا، تب سپنا ماسی نے کہا بھی تھا کہ ببلو تیری بہن تو سجا دی (شہزادی) لگ رہی ہے، اب کچھ ہی دنوں میں یہ بھی تیری ہی طرح شرارت کرے گی۔

ببلو نے کہا، ماسی میں سب سے پہلے اسے تیرنا سکھاؤں گا، ببلو گاؤں کی ندی میں جا جا کر تیرتا تھا، تیرنا اس کا مشغلہ تھا۔

سپنا نے ہنس کر ببلو کو ہلکی چپت لگائی، چل ہٹ بھی۔۔۔۔۔

سپنا بھی ببلو کو اپنے بیٹے کی طرح مانتی تھی، رانی کی پیدائش پر سپنا بہت فکر مند تھیں کہ یہ میری پہلی اولاد ہے، مجھے تو ڈھنگ سے سنبھالا بھی نہ جائے گا، مائیکے والے کوسوں دور تھے، لیکن، زینب نے سپنا کو ہمیشہ اپنی بہن کی طرح سمجھا، رانی کا بھی وہ بہت حد تک خیال رکھتی تھیں۔

بادل کی گھن گرج اور پانی کی رفتار تیز ہوگئی، اور رفتار ہے کہ بڑھتی جارہی تھی، بڑھتی ہی جارہی تھی۔

کچھ ہی دیر میں اچانک سے ایسا لگا کہ آسمان پھٹ چکا ہے اور پورا گاؤں موسلا دھار طوفانی بارش سے ایک سمندر بن رہا تھا، پانی کی رفتار کی آواز سے ببلو سہم کر باپ سے لپٹا ہوا تھا، زینب بھی گھبرا کر دونوں سے لپٹ گئیں۔

یا اللہ رحم کر رحم۔۔۔۔۔۔ پانی کی رفتار کے ساتھ گھر کے پچھواڑے سے بھی کئی طرح کی چیخ و پکار کی آوازیں آرہی تھیں، دیکھتے ہی دیکھتے طوفان کا زور بڑھ گیا، بارش کی رفتار کم ہونے کے بجائے بڑھتی جارہی تھی۔

فتح خان کو آن کی آن کچھ اندازہ ہوا کہ پچھلے دنوں شہر گیا تب ٹی وی پر بادل پھٹنے کی خبریں سنی تھیں یہ بھی وہی قیامت ہے، دیکھتے دیکھتے گاؤں کے کچے اور پکے گھر سب ہی طوفان کی زد میں آنا شروع ہو گئے، رات کا پہر گزر کر صبح صادق کا وقت شروع ہو چکا لیکن بارش کی رفتار میں کمی نظر نہیں آرہی تھی۔

طوفان کی آواز اور انسانوں کی آوازوں میں کس کی آواز اونچی ہے اندازہ لگانا مشکل ہو رہا تھا، دیکھتے ہی دیکھتے قدرت کے قہر نے اس گاؤں کے نہ جانے کتنے لوگوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، اس چیخ پکار میں زینب کو سپنا اور اس کے شوہر کی چیخیں صاف سنائی دے رہی تھیں، زینب کا دل بیٹھا جارہا تھا، زینب اور فتح خان نے ببلو کو بہت مضبوطی سے پکڑے رکھا، دن نکلنے کے ساتھ ساتھ کئی گھروں کی دیواریں ڈھ گئیں، فتح خان کے بھی آنگن کی کچی دیوار دھڑام سے گر پڑی اور پانی میں ڈوب گئی۔

کھلے آنگن سے باہر کا خوفناک منظر صاف دکھائی دے رہا تھا، لوگوں کے کئی سامان پانی پر تیرتے نظر آنے لگے، لوگ بھی پانی کے بہاؤ میں بہنا شروع ہو چکے، پھر اچانک سے تیز موسلا دھار بارش کا ایک ریلہ فتح خان اور زینب کو تیز رفتاری سے بہا لے گیا، ان دونوں نے ببلو کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا، تینوں نے ہمت جٹا کر ہاتھ نہیں چھوڑے اور مسلسل چیخ پکار کیے جارہے تھے، لیکن مدد کو، کون آئے گا، سب ہی طوفان کی زد میں تھے۔

یہ تینوں دور تک بہتے ہوئے ایک درخت سے ٹکرا کر رک گئے، موقع کی نزاکت سے فتح خان اور زینب نے ایک ہاتھ سے درخت کی ٹہنی کو مضبوطی سے پکڑ لیا، اور دوسرے ہاتھ سے ببلو کے بازوؤں کو پکڑ کے رکھا، پھر کیا دیکھتے ہیں کہ سپنا اور کشور پانی کے تیز دھارے سے آکر ان کے سامنے سے ہوتے ہوئے بہت دور نکل گئے۔ زینب چیختی رہ گئی۔۔۔ سپنا۔۔ سپنا۔۔۔ سپنا۔۔۔تبھی پانی کے ریلے میں رانی کا پالنا بہتا ہوا نظر آیا۔۔۔ چھ ماہ کی ننھی رانی پالنے میں بے سدھ پڑی تھی۔۔۔۔ سپنا کی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔۔۔ کشور بھی پوری قوت سے چلا رہا تھا۔۔۔ رانی۔۔۔۔ رانی۔۔۔۔ سپنا کی آواز بھی دور ہوتی گئی، دیدی میری رانی کو بچالو۔۔۔۔۔ رانی کو بچالو۔۔۔ سپنا کی آواز مدھم ہو چکی تھی، وہ اور اس کا شوہر نظروں سے اوجھل ہو کر پانی کے ریلے میں بہہ گئے، رانی کا پالنا کسی مضبوط بڑے پتھر میں اٹک گیا، بارش کی رفتار سے کسی کو بھی زندگی کی امید نہیں تھی، بارش کے پانی کے ساتھ ساتھ انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر نظر آرہا تھا، ہر کسی کے چہروں پر خوف و ہراس چھایا ہوا تھا، جدھر بہاؤ ہو، لوگ ادھر بہہ رہے تھے۔۔۔۔۔

فتح خان کو اندازہ تھا کہ اب اپنی ٹہنی بھی ٹوٹنے ہی والی ہے، رانی کا پالنا بھی پتھر سے لڑھکنے ہی والا تھا کہ ببلو نے ایک جھٹکے سے ماں اور باپ کے مضبوط ہاتھوں سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور تیزی سے چھلانگ لگا کر لڑھکتے ہوئے پالنے سے رانی کو کھینچا پر

صرف رانی کا جمپر ہاتھ میں آیا، فتح خان اور زینب کی دلخراش چیخیں فضا میں گونج رہی تھیں، فتح خان کی پکڑی ہوئی ٹہنی ٹوٹ گئی اور وہ بہتے ہوئے ببلو کے قریب پہنچ گئے، ببلو نے رانی کے دونوں پیر مضبوطی سے پکڑ کر کھینچے اور اسی لمحے پالنا پانی کے بہاؤ میں بہہ گیا، اور ببلو نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر فوراً فتح خان کی طرف رانی کو پکڑایا فتح خان نے بڑی پھرتی سے رانی کو پکڑ لیا پانی کے زور نے پتھر کو دھکیل دیا اور پتھر ببلو کو لے کر دور نکل گیا، فتح خان اور زینب کی آوازیں حلق میں اٹک گئی، ببلو کو دور تک جاتا دیکھتے رہ گئے اس کے بعد انھیں ہوش نہیں تھا کی کیا ہوا،۔۔۔۔۔ ہوش آنے پر دیکھا تو وہ کچھ جھاڑیوں میں اٹکے پڑے تھے فاصلے پر فتح خان، ننھی رانی زینب کے گلے میں پھنسے پلو کو پکڑ کر کھینچ رہی تھی، آن کی آن میں انھیں سارا منظر یاد آ گیا، کچھ لوگوں کی ہلچل اور باتوں سے پتہ چل رہا تھا کہ سولہ گھنٹوں کی تیز رفتار بارش کے بعد بارش دھیرے دھیرے کم ہو چکی تھی، اور بہتے ہوئے پانی کو بھی کم ہونے میں کئی گھنٹے لگ چکے تھے، چاروں طرف دلدل۔۔۔

راحت کمیٹیاں زندہ انسانوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر بچانے کا کام کر رہی تھیں، انھیں بھی کہیں پہنچایا گیا، کہیں ٹھکانہ دلانے کے لیے فتح خان اور زینب کے نام بھی لکھے گئے، کسی راحت کاری جوان نے زینب کو ننھی بچی تھمائی کہ فکر نہ کریں آپ کی بیٹی زندہ ہے، ۔۔۔۔ نام لکھوائیں ۔۔۔۔۔ زینب کچھ دیر بغور دیکھتی رہی، آنکھوں میں سمندر کا سیلاب آ چکا تھا، اپنی بے بسی پر قدرت کا کمال دیکھ رہی تھیں، پھر دھیمی آواز میں کہا، لکھیں، رانیا کرن، فتح خان اپنی بے بسی پر چپ سادھے ہوئے تھا۔۔۔۔ رانیا کرن کے گلے میں اب بھی ببلو کا پہنایا ہوا تاج اٹکا ہوا تھا، جو سر سے سرک کر گلے پر پھنس چکا تھا، آن کی آن سپنا کو کرن بہت بڑا بوجھ لگنے لگی، اس نے نفرت سے کرن کو دیکھا اور اسے لگا کہ یہی ببلو کی موت کی ذمہ دار ہے، نہ چاہتے ہوئے بھی زبردستی دونوں ہاتھ آگے بڑھا کر، کرن کو تھاما۔

تب سے آج تک ڈھائی سال کا عرصہ بیتنے پر بھی فتح خان اور زینب صرف زندہ تھے ببلو کے بغیر جی رہے تھے اور اپنی بے مقصد زندگی کو گھسیٹے جا رہے تھے۔

کرن کی آواز پر زینب چونک کر اپنی بیتے گئے وقت سے باہر آئی رات بہت بیت چکی تھی، صبح ہونے میں کچھ ہی وقت باقی تھا۔

فتح خان بھی اپنی سوچوں سے باہر آ کر دھیمی آواز میں زینا سے مخاطب ہوا۔

جے نا۔۔ کیا تم بھی وہی سوچ رہی ہو، جو میں نے سوچا ہے۔

وہ بے اختیار ہاں،، کہہ بیٹھیں۔

کیوں نہ ہم اس طوفان کو بھول کر نئی زندگی شروع کریں، فتح خان نے آنسوؤں کو روکتے ہوئے کہا۔

زینب سمجھ گئی کہ وہ کیا کہنا چاہ رہا ہے، وہ بولی۔۔۔۔ ہاں فتو، میں بھی چاہ رہی ہوں کہ ببلو کی قربانی کو یوں ہی ضائع نہ ہونے دیں وہ تو ہمیں سکھا گیا کہ مذہب اور دھرم ایک ہی نام ہے، پھر ہم کیوں اسے بانٹ دیں۔۔۔۔ سیلاب نے یہ نہیں دیکھا کہ یہ کس دھرم کا نقصان ہے،

نقصان تو سب کا ہوا، ہمارا نقصان واپس نہیں ملے گا، ہم کیوں نہ محبت بانٹ دیں۔

ہاں جے نا تم ٹھیک کہہ رہی ہو، فتح خان اور زینب دونوں بیک وقت ایک ساتھ اٹھے اور کرن کو گلے لگا کر بے اختیار چومنے لگے، اور دونوں کے آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی جاری ہوگئ، شاید کہہ رہی ہو کہ ہم اب اس کے بعد تمھاری آنکھوں سے کبھی نہیں بہیں گے، کرن اپنی نئی صبح کا پیار پا کر خوش ہو رہی تھی،

فتح خان نے کیل پر لگے دھول میں اٹے موتیوں کے تاج کو نکالا صاف کیا اور کرن کے سر پر لگا دیا، آن کی آن کرن ایک فتح خان اور زینب کی نظروں میں شہزادی لگنے لگی، ببلو کی ننھی شہزادی۔

❑❑❑

Sadiya Fatima
C/o Abdul Khaliq
Near Peeli Building, Mandhai
Nanded-431604 (M.S)

افسانہ

فوزیہ حبیب

بیٹیاں

نام تو اس محلے کا امن آباد تھا لیکن مجال ہے جو کبھی امن اور سکون جیسے الفاظ سے پالا پڑا ہو۔ اس محلے میں پس ماندہ طبقہ رہائش پذیر تھا۔گالی گلوچ، مار پٹائی، گھریلو جھگڑے، پڑوسیوں کے جھگڑے روزمرہ کا حصہ تھے اور یہ جھگڑے محلّے والوں کے لیے بہترین تفریح کا ذریعہ تھے۔دو پڑوسیوں کی لڑائی میں محلے والے بخوشی تماش بین کا کردار ادا کرتے ۔کچھ لوگ آگ میں تیل ڈالنے کا کام اپنا فرض عین سمجھتے تھے۔صلح صفائی کے لیے بعض معمرافراد مخصوص تھے۔آئے دن محلے میں رونق لگی رہتی۔کبھی کوئی دن امن سے گزرتا تو محلے والوں کے دل بے امن ہو جاتے۔

سکینہ اور زینت کے گھر بالکل قریب تھے۔دیوار سے دیوار ملی ہوئی تھی۔ دونوں ہی جنگجو طبیعت کی تھیں چھوٹی چھوٹی باتوں پر ہنگامہ کھڑا کر دیتیں کبھی بچوں کی لڑائی کو لے کر تو کبھی پینے کے پانی کے مسئلہ پر۔رضیہ کا گھر چار مکان چھوڑ کر تھا۔ وہ لگائی بجھائی کے کام میں ماہر تھی اور ان دونوں کی لڑائی کا خوب فائدہ اٹھاتی تھی۔

حسبِ معمول آج بھی دونوں طرف سے گولہ باری جاری تھی کبھی ایک تھمتی تو دوسری شروع ہو جاتی۔ محلے والے اس تماشے کے عادی تھے۔پھر بھی سب کے سر باہر نکلے ہوئے تھے۔صبح دس بجے کا وقت تھا۔گھروں میں ہزاروں کام کرنے کے پڑے ہوئے تھے لیکن دفع کرو کاموں کو۔وہ تو جی کا جنجال ہیں۔یہ بنا ٹکٹ کے مفت میں جو فلم دیکھنے کو ملی ہے اس کا مزہ تو کچھ اور ہی ہے۔

’’دیکھ سکینہ !آخری بار کہہ رہی ہوں۔تیرے گھر کا کچرا میرے دروازے پر نہیں ہونا چاہیے‘‘ زینت نے وارننگ دیتے ہوئے کہا۔

’’اری چپ ! تو نے جو شترِ بے مہار جیسا منڈا پیدا کیا ہے۔ اس نے کرکٹ کے نام پر گلی ڈنڈا کھیل کر ہماری زندگی حرام کر رکھی ہے۔‘‘

’’ہاں ! یہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔واقعی تیرے چھوکرے نے محلے والوں کا ناک میں دم کر رکھا ہے۔‘‘

پڑوس والی خالہ نے بھی گھی ڈالنا اپنا فرض سمجھا۔

’’ اے خالہ ! تم چپ کرو۔تمہارا مرد جو دن دھاڑے شراب پی کر محلے میں اودھم مچاتا پھرتا ہے وہ کم ہے کیا؟

’’ زینت کے تلووں سی لگی تو سر پر بجھی۔خالہ دبک کر اندر چلی گئیں۔اچھی طرح ایک دوسرے پر دل کی بھڑاس نکال کر وہ دونوں بھی اندر چلی گئیں۔سب کے سر بھی اندر گھس گئے۔گویا اب چراغوں میں روشنی نہ رہی۔رضیہ بھی ان کے جانے کے بعد گھر کا کام جلدی جلدی نبٹانے لگی۔ابھی پہلے اس کا ارداہ سکینہ کے گھر جانے کا تھا۔

زینت کا بیٹا راشد ان دنوں کچھ بدلا بدلا سا لگ رہا تھا۔ پہلے تو وہ محلے کی سب لڑکیوں کو چھیڑتا، آوازیں کستا اور سیٹیاں بجاتا تھا۔لیکن اب کچھ دنوں سے چپ چاپ رہنے لگا تھا۔رضیہ کو کھد بدسی ہوئی

''سن سکینہ ! یہ جو راشد ہے نا۔اس نے ضرور کوئی گھپلا کیا ہے''

''کیا مطلب ؟سکینہ چونک گئی۔خالہ کسی کام سے آئی تھیں۔وہ بھی وہیں پھسکڑے مار کر بیٹھ گئیں۔

''ضرور اس نے کوئی چوری چکاری کی ہوگی اور پولیس کے ڈر سے خاموش بیٹھا ہے۔کہیں پولیس اسے ڈھونڈتے ہوئے محلے میں آ گئی تو سب لوگوں نے تو شکایت کر دینی ہے۔ویسے بھی سب اس سے تنگ ہیں۔''

''اچھا! کیا واقعی ایسا ہے ؟

''مجھے صحیح سے تو نہیں معلوم۔ ہاں! کل وہ ٹوپی پہن کر بیٹا (معصوم) بنا عصر کی نماز کو جا رہا تھا۔'' اس نے رازداری کی انتہا کر دی۔

''ہوسکتا ہے وہ سدھر گیا ہو۔پچھلے ہفتے محلے میں جو جماعت آئی تھی۔انہوں نے سب مردوں کو بٹھا کر دین کی باتیں سمجھائی تھیں۔ایسا نوید (بیٹا) کہہ رہا تھا۔'' خالہ نے کہا۔

رضیہ کو مایوسی ہوئی۔وہ تو سوچ رہی تھی کہ محلے میں کچھ رونق لگے گی۔اتنے میں زوردار آواز آئی۔خالہ نے دل پر ہاتھ رکھ لیا

''ہائے میرا دروازہ پہلے ہی ایک طرف سے اُکھڑا ہوا ہے۔کمبختوں نے جینا حرام کر رکھا ہے۔''

خالہ کوستی ہوئی باہر چلی گئیں۔

اُس دن رضیہ زینت کے گھر چینی مانگنے آئی۔ پتہ تھا کہ پہلے کا ادھار ابھی باقی ہے۔زینت دو چار باتیں سنا کر ہی دے گی لیکن مجبوری تھی۔سکینہ اپنے رشتہ داروں کے گھر گئی تھی۔خالہ سے تو مانگنے کا سوال ہی نہیں تھا۔الٹا وہ خود کچھ نہ کچھ لینے ہر بار آ جاتی تھیں اور محلے کے باقی پڑوسیوں سے اس کی بنتی نہیں تھی۔جب وہ زینت کے گھر پہنچی تو وہ اپنی پھٹی پرانی چپل لیے راشد کے پیچھے دوڑ رہی تھی اور راشد اپنے بچاؤ کے لیے دونوں ہاتھ اپنے چہرہ پر رکھے آگے بھاگ رہا تھا۔

''کیا ہوا زینت ؟ کیوں بچے کو مار رہی ہے؟''

''تو اپنے کام سے کام رکھ۔بتا کیوں آئی ہے؟''

''وہ میں تھوڑا شکر لینے آئی تھی۔ پکا اس بار دونوں ادھار چکا دوں گی'' اس نے زینت کے کچھ کہنے سے قبل وعدہ کیا۔کوئی اور وقت ہوتا تو زینت اس کے وعدوں کی وہ درگت بناتی کہ وہ یاد رکھتی۔لیکن اس نے بنا کچھ کہے کٹوری میں چینی لا کر دے دی۔اب تو اس کو شک ہو گیا کہ ضرور دال میں کچھ کالا ہے''

''اے زینت ! تو اتنی غصہ میں کیوں ہے؟

> **''اُس دن رضیہ زینت کے گھر چینی مانگنے آئی۔ پتہ تھا کہ پہلے کا ادھار ابھی باقی ہے۔زینت دو چار باتیں سنا کر ہی دے گی لیکن مجبوری تھی۔سکینہ اپنے رشتہ داروں کے گھر گئی تھی۔خالہ سے تو مانگنے کا سوال ہی نہیں تھا۔الٹا وہ خود کچھ نہ کچھ لینے ہر بار آجاتی تھیں اور محلے کے باقی پڑوسیوں سے اس کی بنتی نہیں تھی''**

''یہ میرا لونڈا عشق کر بیٹھا ہے اور اب شادی کرنے کا کہہ رہا ہے؟'' زینت کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔مجال ہے جو کوئی بات پیٹ میں ٹک جائے۔امن آباد کے گھروں کی خاصیت ہی یہی تھی کہ کوئی راز چھپائے سے بھی نہیں چھپتا تھا۔

''اچھا؟'' رضیہ کی آنکھیں پھٹ گئیں

''دو روپے کمانے کی اوقات نہیں ہے اور چلا ہے شادی کرنے''

''اماں ! وہ مولوی صاحب کہہ رہے تھے کہ شادی کرنے سے برکت ہوتی ہے''

''چپ کر! ورنہ زبان گدی سے کھینچ لوں گی۔''

''کوئی لڑکی دیکھی ہے؟" رضیہ نے تجسس سے پوچھا۔ زینت نے خونخوار نظروں سے اسے گھورا۔

''خالہ! وہ اپنی پینو ہے نا'' راشد کی بات پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ رضیہ اچھل پڑی۔

''پنو ؟؟ زینت ! یہ پنو سے شادی کرنا چاہتا ہے؟''

> رضیہ باہر نکل گئی۔اب اسے اندازہ ہوا کہ راشد کی شرافت میں رہنے کا راز کیا ہے۔ لیکن پنو ؟ سکینہ کی بیٹی پنو ؟ اسے سچ مچ گدگدی ہو رہی تھی۔اسے سکینہ کے گھر آنے کا انتظار تھا

'' مجھے پتہ ہے تجھے گدگدی ضرور ہوگی اور ابھی دو منٹ میں تو یہ خبر پورے محلے میں پھیلا دے گی۔میری بلا سے جس کو سنانا ہے سنا دے۔لیکن شیدے! تو مجھ سے بچے گا نہیں'' وہ پھر سے راشد پر جھپٹی۔

رضیہ باہر نکل گئی۔اب اسے اندازہ ہوا کہ راشد کی شرافت میں رہنے کا راز کیا ہے۔لیکن پنو؟ سکینہ کی بیٹی پنو؟ اسے سچ مچ گدگدی ہو رہی تھی۔اسے سکینہ کے گھر آنے کا انتظار تھا۔

'' ہمت کیسے ہوئی تیرے آوارہ اور نکمے بیٹے کی کہ وہ میری بیٹی سے شادی کا سوچے " صبح پھر تماشا لگا ہوا تھا۔زینت نے دانت کچکچا کر رضیہ کو دیکھا اس کا بس چلتا تو وہ رضیہ کو کچا چبا جاتی۔رضیہ اس کو نظر انداز کر کے ڈھٹائی سے کھڑی تھی۔

'' دیکھ سکینہ! میں تیرے منھ نہیں لگنا چاہتی۔میں نے شیدے کی اچھی طرح ٹھکائی کی ہے۔بات ختم۔ جا اپنا کام کر اور مجھے بھی کرنے دے''

'' کیوں وہ بات ختم کرے؟۔اس کی بیٹی کی عزت کا معاملہ ہے'' رضیہ بیچ میں کودی۔

'' تو تیرے پیٹ میں مروڑ کیوں اٹھ رہے ہیں؟ دفع ہو جا یہاں سے''

اس نے چیخ کر کہا اور اندر چلی گئی۔

'' تو اپنے نمونے بیٹے کو نکیل ڈال کر رکھ۔ورنہ پنو کا ابا تیرے نمونے کو دھو کر رکھ دے گا" سکینہ بھی پیچھے سے چیخی رضیہ نے سکینہ سے ہمدردی دکھانے کی کوشش کی۔لیکن بھلا ہوا خالہ کا۔انھوں نے بات سنبھال لی۔

'' دیکھ سکینہ ! شیدا جیسا بھی ہے۔لیکن اس نے پنو سے کوئی بدتمیزی نہیں کی ہے اور زینت نے بھی شیدا کی اچھی طرح خبر لی ہے۔تو بھی بھول جا۔مٹی ڈال اس قصہ پر۔''

سکینہ سر جھٹک کر اندر چلی گئی۔رضیہ کو سکینہ سے ہمدردی کا بخار صرف دو دن تک تھا۔تیسرے دن کسی بات پر ان دونوں کی زبردست لڑائی ہوئی اور تب سے وہ موقع کی تلاش میں تھی کہ وہ سکینہ کو نیچا دکھائے۔

سکینہ کی بیٹی پنو کا رشتہ دوسرے گاؤں سے آیا تھا رضیہ مہمانوں کو سکینہ کی نظر سے بچا کر زینت کے گھر لے کر آئی۔

'' یہ لڑکے کے گھر والے ہیں۔چھان بین کے سلسلے میں محلے والوں سے ملنا چاہتے تھے۔اس لیے یہاں لے کر آ گئی'' اس نے زینت کے گھورنے پر جلدی سے کہا۔

'' کیوں زینت ! تو بتا سکینہ کی بیٹی کے لچھن کیسے ہیں۔وہ غیر مردسے گپّے لگاتی پھرتی ہے نا'' رضیہ نے آنکھیں مٹکاتے ہوئے کہا۔

'' کیوں جھوٹ بول کر گنہگار ہو رہی ہو رضیہ؟ زینت نے ڈپٹتے ہوئے کہا اور مہمانوں سے بولی۔

بہن ! بچی اچھے کردار کی اور رکھ رکھاؤ والی ہے آپ اطمینان سے رشتہ کریں''

'' تو نے یہ کیا کیا زینت ؟ سکینہ سے بدلہ لینے کا موقع اتنی آسانی سے چھوڑ دیا۔"

مہمانوں کے جانے کے بعد رضیہ نے کہا

''چپ رہو! خبردار! کسی کی بیٹی کے بارے میں غلط سلط کہا تو بیٹیاں سب کی سانجھی ہوتی ہیں۔

□□□

FOUZIA HABEEB
Assistant Professor
Department of Urdu
TAW College for Women
Solur, Ambur-635814 (Tamil Nadu)
fouziahabeeb05@gmail.com

ارتباط

خواتین دنیا، دسمبر کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ اس کا سرورق بہت معنی خیز ہے، ایک طرف کتاب وقلم اور دوسری طرف خاتون کا دماغ اور اس میں متعدد خواتین کی شمولیت کئی در وا کرتا ہے۔ یہ سرورق دیکھ کر محسوس ہوا کہ خواتین اپنے بیانیے سے مرد اساس معاشرے کا منظر نامہ بدل سکتی ہیں۔ یہ شمارہ چھ اصناف سخن میں منقسم ہے اور ان کے ذیل میں نثر و نظم کے ادب پارے ترتیب دیئے گئے ہیں۔ اس شمارے کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں محض دو مردوں کے مضمون ایک ذکیہ مشہدی کی شخصیت اور فن پر لکھا گیا ہے دوسرا ڈاکٹر بانو سرتاج کی مضمون نگاری پر اسرار الحق سبیلی نے لکھا ہے۔ باقی سبھی اصناف خواتین کے نام ہیں۔ مضامین، بہت عمدگی سے منتخب کئے گئے ہیں۔ پہلا مضمون رضیہ سلطانہ کا 'فاطمہ شیخ: ہندوستان کی پہلی مسلم معلّمہ' ہے اس مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ خواتین دنیا میں واقعی خواتین پہ کام کیا جارہا ہے۔ رضیہ سلطانہ کی یہ تحقیقی کاوش کسی حد تک کامیاب رہی۔ دوسرا مضمون جہان نسواں کے تحت 'ڈاکٹر بانو سرتاج: بہ حیثیت بچوں کی مضمون نگار' کے عنوان سے سید اسرار الحق سبیلی نے لکھا ہے۔ اس مضمون میں بانو سرتاج کی مضمون نگاری کا جائزہ لیا گیا ہے۔ بانو سرتاج بچوں کے لیے کم وبیش ننانوے کتابیں لکھ چکی ہیں۔ اس تعلق سے یہ مضمون عمدہ ہے۔ اس مضمون میں بانو سرتاج کی شخصیت اور فکری تشکیل ظاہر ہورہی ہے۔

دوسرا مضمون اردو کی ایک اہم صنف 'ماہیا نگاری' پر ہے۔ اس کا خاص علاقہ پنجاب ہے۔ پنجاب میں ماہیا سب سے زیادہ مقبول ہے۔ اس مضمون میں سیدہ تفسیر فاطمہ نے 'ماہیا نگاری' پر بڑی تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ اس کے علاوہ اس کی بحر اور تقطیع بھی مفصل انداز میں بیان کی ہے۔ ہر لحاظ سے یہ مضمون عمدہ ہے جس میں ایک صنف کا مکمل احاطہ موجود ہے۔ اگلا مضمون مسرت نذیر صاحبہ کا اردو سفرنامے کی روایت کے عنوان سے ہے جس میں انھوں نے ایک سادہ سی روایت بیان کردی ہے۔ اس کے علاوہ درخشاں شمیم کا مضمون 'مغربی بنگال میں افسانچہ نگاری اکیسویں صدی میں' بھی ایک نیا تجربہ ہے۔ افسانچہ جدید نثری صنف ہے اور مغربی بنگال میں اسے بہت مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ اس مضمون میں افسانچہ نگاری کو اکیسویں صدی کے تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ذکیہ مشہدی اردو دنیا میں محتاج تعارف نہیں۔ ان کا مضمون ذکیہ مشہدی کی شخصیت اور فن پر مبنی ہے۔ دیگر مثلاً یوسف سرمست اور اردو ناول کی تحقیق وتنقید شامل ہے۔ یہ مضمون رہنما بانو کا تخلیق کردہ ہے، انھوں نے بڑی محنت سے یوسف سرمست کی تحقیقی اور تنقیدی صلاحیت کا اجاگر کیا ہے۔

شمارے کی دوسری سرخی 'انشائیہ' ہے شفاء زربان کا انشائیہ 'آج مجھ سا نہیں زمانے میں' لطف اور چٹخارے سے مزئین ہے۔ اگلی سرخی 'نقد ونظر' ہے اس میں ایک اہم مضمون 'ثقافتی تشخص اور خواتین کی نفسیاتی بااختیاری' شامل ہے یہ مضمون خالص خواتین کی نفسیات پر مبنی ہے۔ مجموعی طور پر دسمبر کا شمارہ بہت عمدہ ہے اور خواتین دنیا اپنے عنوان سے انصاف کرتا ہوا نظر آیا۔ یہ بات میں اس کی شمولیات کی بنا پر کہہ رہی ہوں کہ پچھلے شماروں میں مرد حضرات کے مضامین کی بہتات تھی اس کے برعکس اس شمارے میں خواتین کی بہتات نظر آئی۔

خوشندہ جمیل، طالبہ بی ایڈ (اردو) مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد۔ سینٹر آف ٹیچر ایجوکیشن سنبھل (یوپی)

□□□

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

ویر ساورکر اور تقسیم ہند کا المیہ

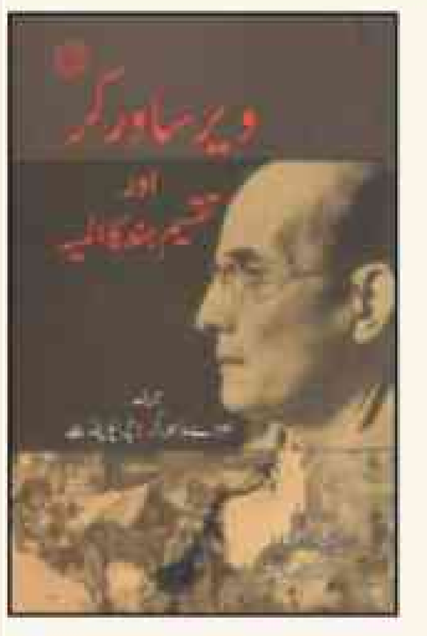

تالیف: اودے ماہورکر، چرایو پنڈت

مترجم: پروفیسر مظہر آصف، ڈاکٹر مسعود عالم

پہلا ایڈیشن: 2025

صفحات: 385+xxxviii

قیمت: 240 روپے

ہندوستانی مسلمان: اتحاد کی بنیاد حب الوطنی

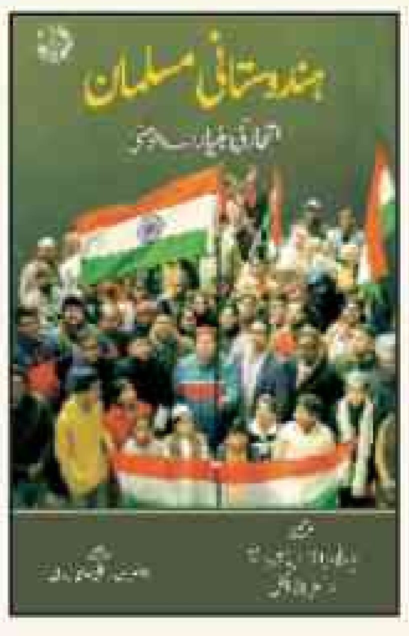

مرتبین: پروفیسر (ڈاکٹر) شاہد اختر

ڈاکٹر کیشو پٹیل

مترجمین: ڈاکٹر نصیب علی، محمد عارف

پہلا ایڈیشن: 2025

صفحات: 211+xl، قیمت: 150 روپے

کلیاتِ سعادت حسن منٹو (جلد دوم)

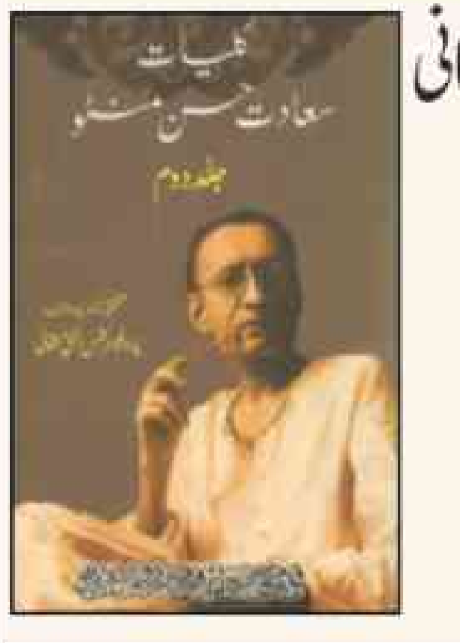

تحقیق، تدوین و ترتیب: پروفیسر شمس الحق عثمانی

تیسرا ایڈیشن: 2025

صفحات 576+23

قیمت: 305 روپے

ٹیگور بتیسی (ٹیگور کے بتیس افسانوں کا انتخاب)

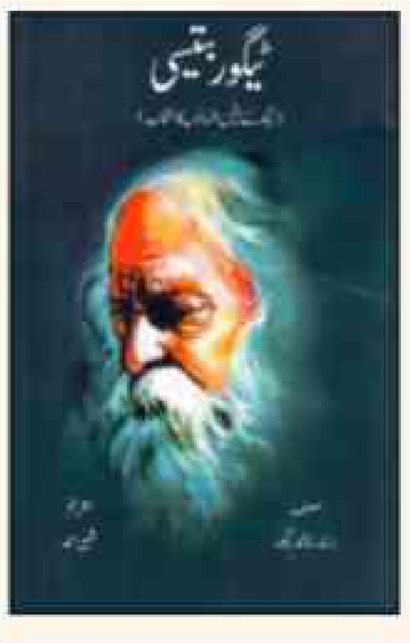

مصنف: رابندر ناتھ ٹیگور، مترجم: شبیر احمد

پہلا ایڈیشن: 2025

صفحات: 510+65

قیمت: 300 روپے

مرزا غالب: ایک سوانحی منظر نامہ

مصنف: گلزار

دوسرا ایڈیشن: 2025

صفحات: 247+23

قیمت: 160 روپے

نقوشِ کلام (سوانح حیات ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام)

مصنف: عبداللہ ابن القمر الحسینی

پہلا ایڈیشن: 2025

صفحات: 460+20

قیمت: 255 روپے

Let's Learn Urdu
Beginner's Mannual for Urdu Script

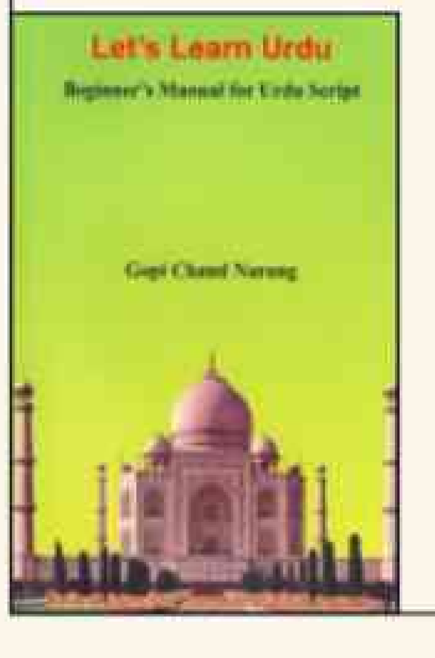

مصنف: گوپی چند نارنگ

ساتواں ایڈیشن: 2025

صفحات: 111

قیمت: 65 روپے

Work Book: Let's Learn Urdu
Beginner's Mannual for Urdu Script

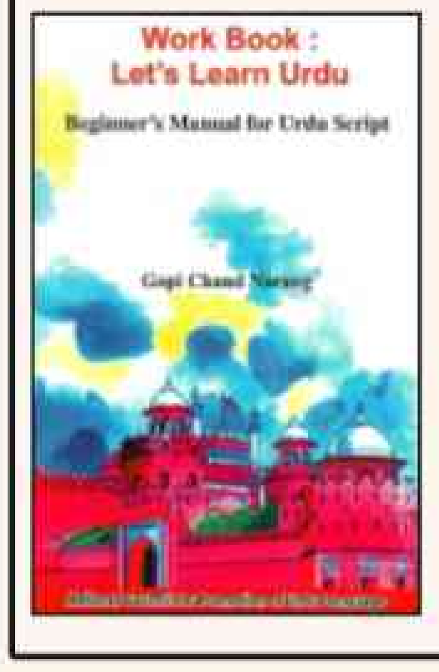

مصنف: گوپی چند نارنگ

ساتواں ایڈیشن: 2025

صفحات: 76

قیمت: 50 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی - 110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

माहनामा ख्वातीन दुनिया मासिक, जनवरी -२०२६ वर्ष: १०, अंक: १
Mahnama Khawateen Duniya Monthly January 2026, Vol. 10, Issue: 1
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI. No. DELURD/2017/74026
DL (S)-17/3555/2024-26
ISSN 2581-4826
Date of Publication: 13-01-2026
Date of Dispatch : 14 and 15 of every month
Total Pages: 64

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

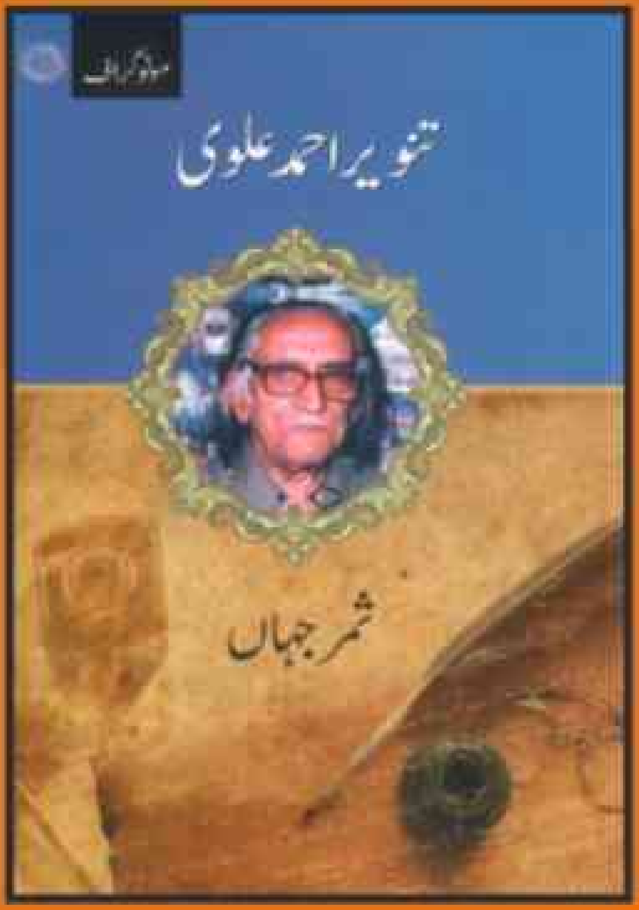

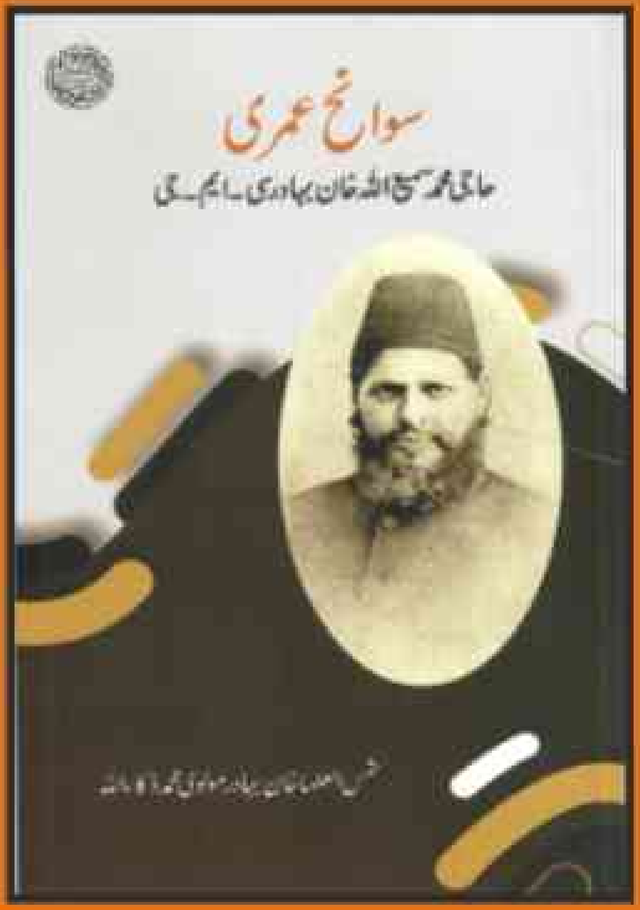

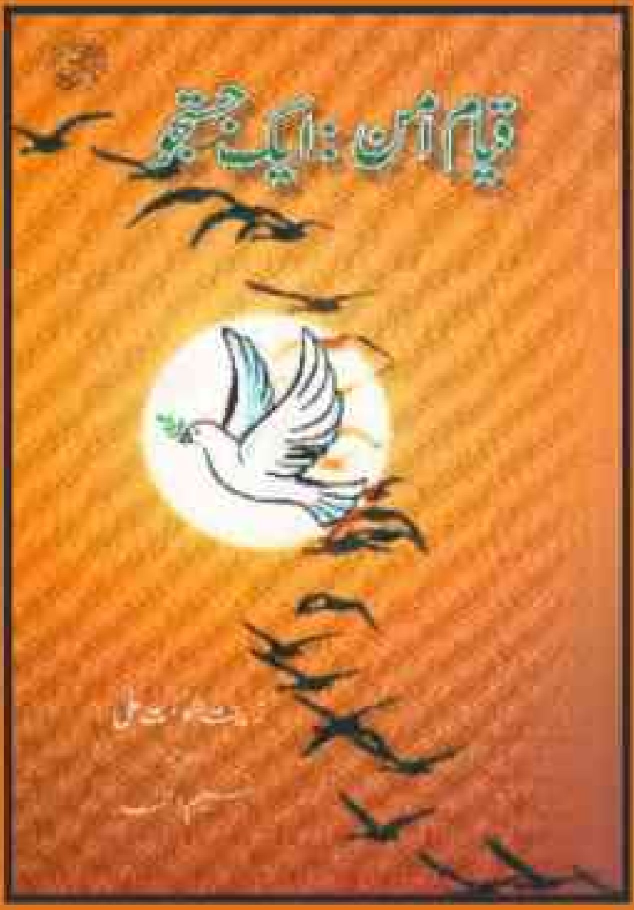

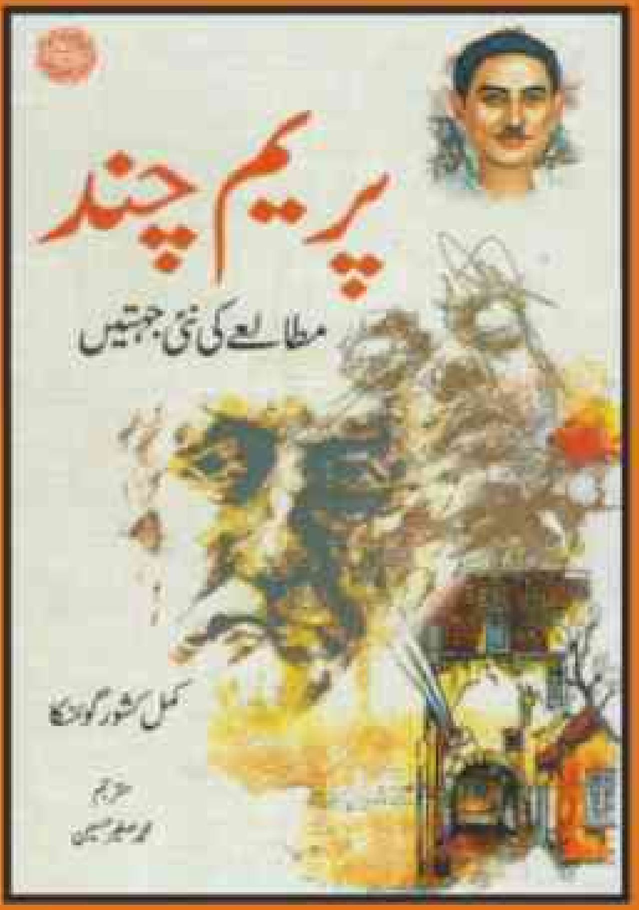

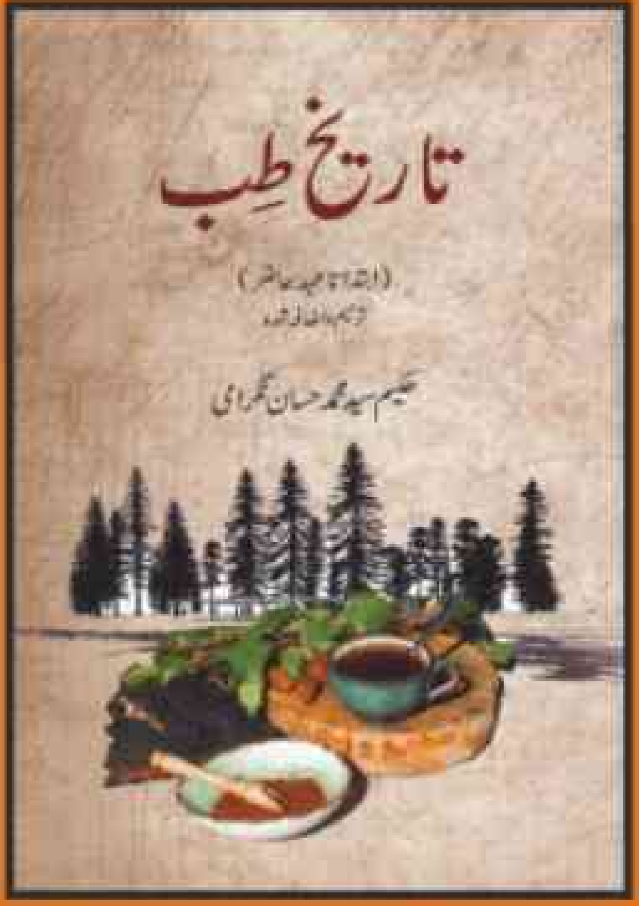

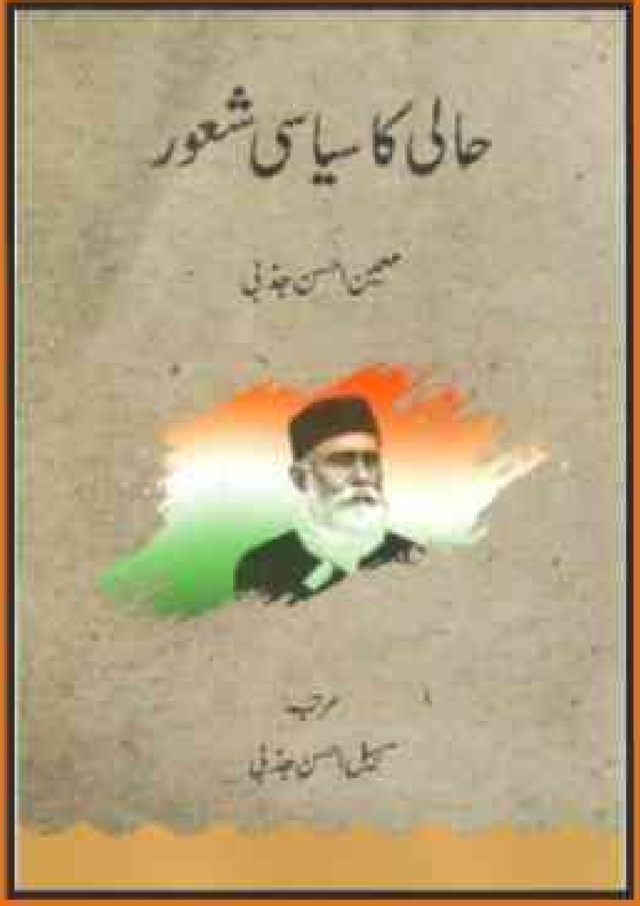

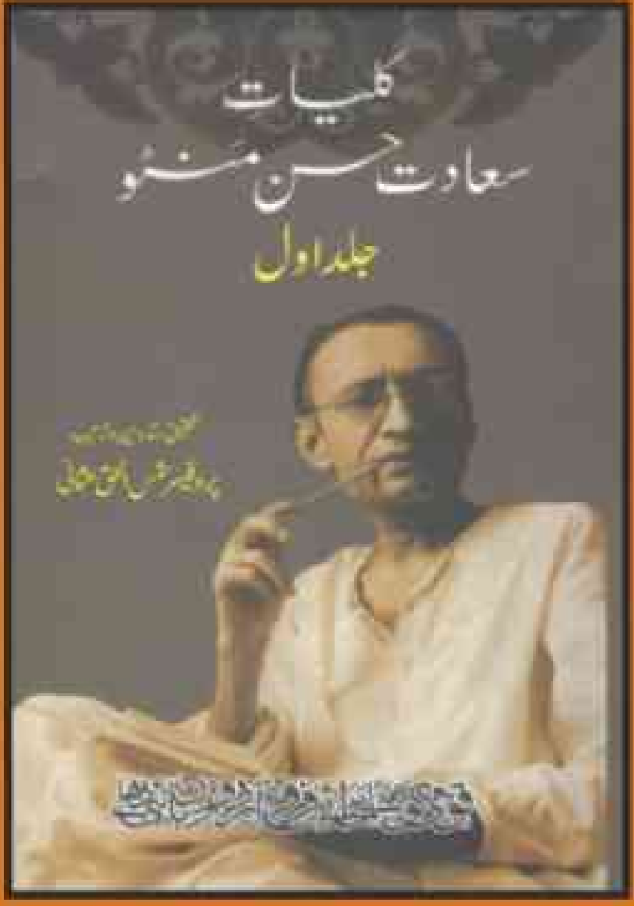

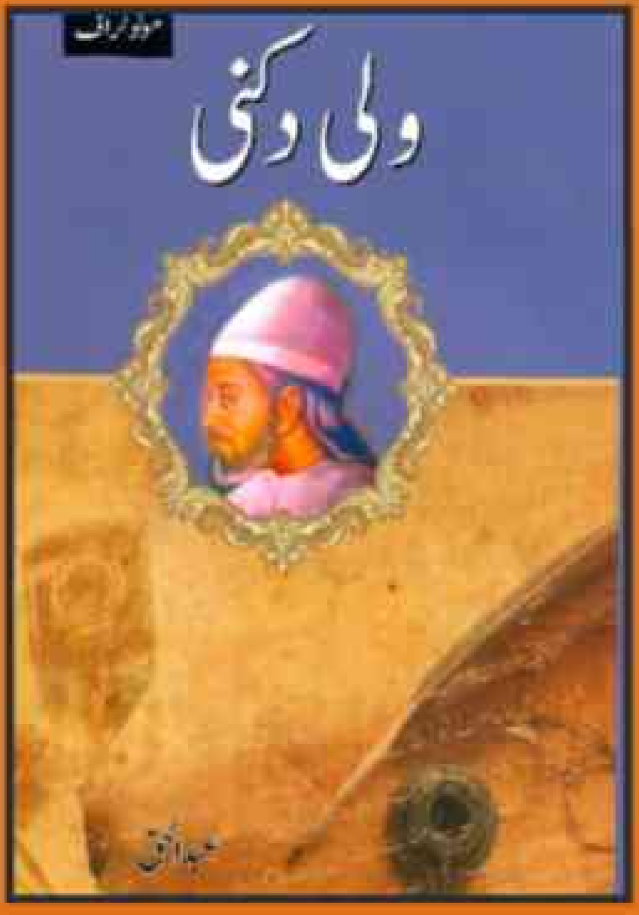

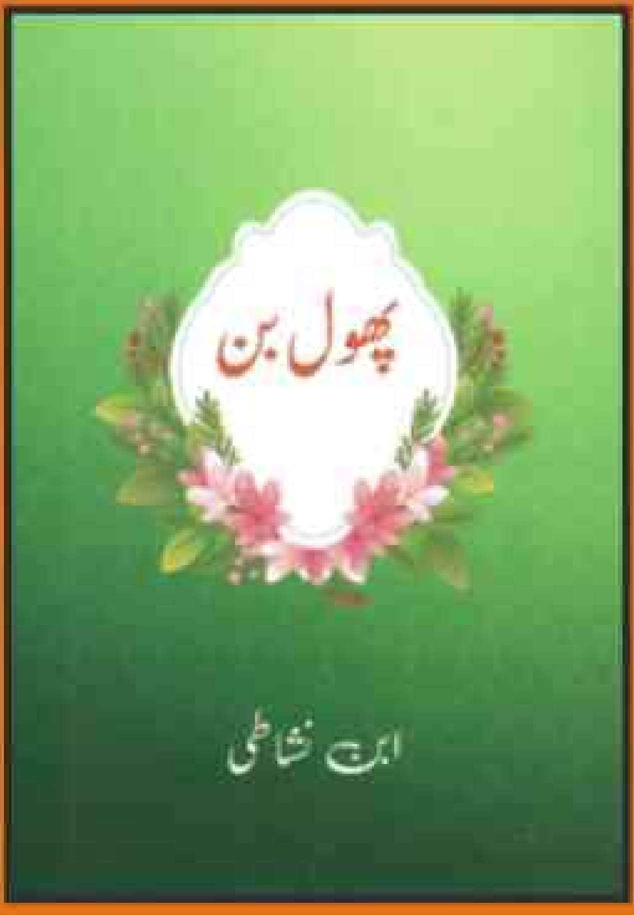

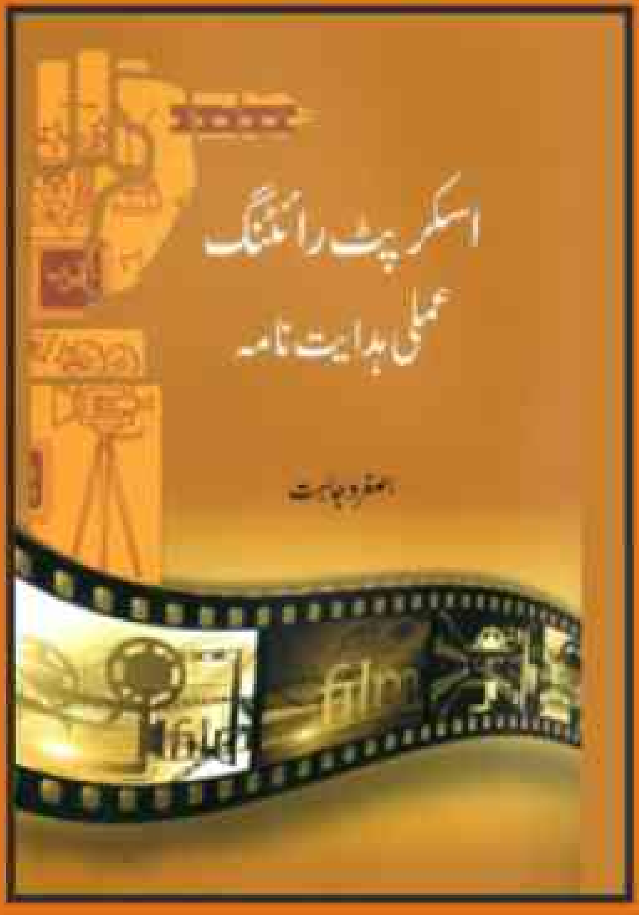

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.: sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Md. Shams Equbal, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at Makoff Printers, B-127, Sector 65, Noida-201301 (U.P)
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025